وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (قرآن مجید-۴-۵۸)

برِصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظامِ عدل گستری

پروفیسر محمد عبدالحفیظ صدیقی

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی

اسلام آباد

Marfat.com

DATA ENTERED

23870
c/2

بار اوّل	فروری ۱۹۶۹ء
طابع	اعجاز احمد زبیری
مطبع	نور آرٹ پریس - راولپنڈی
قیمت	پانچ روپیہ پچاس پیسے

Marfat.com

فہرست

پیش لفظ ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی ۵

دیباچہ ۹

اسلامی عدل گستری کے ماخذ ۱۳

مملکت، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ۔۔ اسلامی تصورِ قانون [illegible]۔ عدل گستری [illegible] جاہلیت میں۔ عدل گستری زمانۂ رسالتؐ میں۔۔ عدل گستری خلافت راشدہ میں۔ عدل گستری اموی اور عباسی دور میں۔

سلطنت دہلی اور اس کا نظام عدل گستری [illegible]

مسلمان ہندوستان میں۔ پنجاب کی حکومت۔ سلطنت دہلی۔ ادارۂ شاہی [illegible] اور سلطنت کی حیثیت۔ عام نظم و نسق۔ سلاطین دہلی [illegible] اور [illegible] اسلام۔ سلاطین کے خصوصی مراعات۔

محکمۂ قضاء یا محکمۂ عدلیہ ۹۰

دیوانِ مظالم۔ دیوانِ قضاء۔ صدر جہان یا صدر کل۔ قاضی۔ قاضی [illegible] عہدہ دار۔ امیر داد۔ دارالسلطنت کی عدالتیں۔ صوبوں یا اقطاع کی عدالتیں۔ [illegible] یا سرکار کی عدالتیں۔ پرگنے کی عدالتیں۔ دیہات کی عدالتیں۔ فوج کی عدالتیں۔ دہلی کے نظام عدل گستری کی خصوصیتیں۔

دکن ۱۱۱

دکن کی سرزمین۔ دکن کی تاریخ کا قدیم دور۔ تاریخ دکن کا وسطی دور۔ دکن پر [illegible]

Marfat.com

کے حملے اور تغلقوں کی حکومت ۔ دکن کی خود مختاری اور امیرانِ صدہ ۔ بہمنی سلطنت ۔
پانچ سلطنتیں :۔
احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ، برار کی عماد شاہی سلطنت ، بیدر کی برید شاہی سلطنت ، بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت ، گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ۔

۱۳۴ بہمنی نظامِ عدل گستری

بہمنی سلاطین اور ادارۂ شاہی ۔ بہمنی سلاطین کا تصورِ عدل اور شرعِ اسلام ۔ محکمہ عدلیہ ۔ مرکز کی عدالتیں ۔ عدالتِ سلطانی ۔ دفتر شاہی ۔ صدر عدالت ۔ عدالت قاضی گلبرگہ ۔ محکمہ فوجداری ۔ محکمہ احتساب ۔ عدالت کوتوال ۔ عدالت قاضی عسکر ۔ مرکز کے عہدہ دارانِ عدلیہ ۔ نظائر اور سزائیں ۔

۱۵۵ نظام شاہی نظامِ عدل گستری

۱۵۸ عادل شاہی نظامِ عدل گستری

۱۶۴ قطب شاہی نظامِ عدل گستری

۱۷۳ تبصرہ

Marfat.com

پیش لفظ

مسلمانوں کا نظامِ عدلیہ اقوامِ عالم کے لئے ازمنۂ وسطیٰ میں صدیوں تک مشعلِ راہ بنا رہا اور دوسری متمدن قوموں کے نظام ہائے عدل گستری پر نمایاں فوقیت کا حامل رہا ہے۔ یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں نیز اہلِ ہند کے بعض قانونی تالیفات کے تراجم سے مسلمان فرمان رواؤں کے عہدِ زریں میں ماہرینِ قانون و قضاء نے کہاں تک استفادہ کیا، اس کا تجزیہ زیرِ بحث نہیں، کہ تہذیب و تمدن کے ارتقا میں اس طرح کے افادے اور استفادے اقوامِ عالم کی تاریخ میں عام ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت صدیوں تک قائم رہی۔ اور ابتدائے عہد سے انگریزی حکومت کے قیام تک مسلمان فرمان رواؤں کا نظامِ عدل ایک [illegible] رہا۔ ملکی نظم و نسق کے ساتھ عدل و انصاف کا محکمہ خاص توجہ کا مرکز رہا۔ ان کے بعض عدل و انصاف کے واقعات اب بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

ہمارے عہد کے محققین و مورخین کی نظر زیادہ تر عہدِ مغلیہ کے مختلف کارناموں پر مرکوز رہی ہے۔ ان کے محکمۂ عدلیہ سے بھی ایک حد تک سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے اور اگرچہ اس عہد سے پیشتر کے سلاطینِ دہلی کے سیاسی اور انتظامی امور پر متعدد بیش بہا تالیفات معرضِ وجود میں آ چکی ہیں، پھر بھی ان کے محکمۂ عدلیہ، نیز دکن کی اسلامی حکومتوں کے نظامِ عدل گستری پر آج تک کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ہمارے علم میں کوئی ایسی تالیف موجود نہیں۔

سلاطینِ دہلی کا زمانہ اسلامی قوانین کی ترتیب و تنظیم کے لئے نہایت اہم زمانہ ہے۔ اس عہد کی یادگار فتاویٰ قاضی خان اور مشارق الانوار جیسی تالیفات ہیں، جن کی بنیاد [illegible] اسلامی

Marfat.com

معاشرے کے لئے طرۂ امتیاز رہی اور جن کا اثر آج تک قائم ہے۔

پروفیسر محمد عبدالحفیظ صدیقی کی کتاب "برصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظامِ عدل گستری" جو قارئین کے پیشِ نظر ہے، تاریخ برصغیر پاک و ہند کی اس کمی کو بڑی حد تک پوری کرتی ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے اسلامی عدل گستری کی توضیح کے ساتھ عہد نبوی، خلافتِ راشدہ، نیز اموی و عباسی دور کے محکمۂ قضاء، ان کے دیوانی و فوجداری قسم کے مقدمات، عہدۂ قضاء، و عہدۂ افتاء کی تفصیلات اور نظائر کی تدوین کے بعد سلطنتِ دہلی کے محکمۂ قضاء اور سلاطینِ دکن کے محکمۂ عدلیہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ مواد کی فراہمی میں مؤلف نے اپنی لیاقت بھر تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ اور کتاب کے مضامین کا تنوع اس پر شاہدِ عدل ہے۔

اس وقت جب کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کی تعمیل کا جذبہ روز افزوں کارفرما ہے۔ توقع ہے کہ اسلامی نظامِ عدل کے بعض واضح نظائر۔ اور سلاطینِ دہلی و دکن کے دیوانی و فوجداری مقدمات کے تفصیلی جائزے، عصرِ حاضر کے اصلاح و تحقیق کے علم برداروں کے لئے، بڑی حد تک اسلامی قوانینِ عدل و قضاء کے افہام و تفہیم میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ اور اسلامی معاشرے کی تشکیل و اصلاح میں مشعلِ راہ کا کام دیں گے۔

۷ فروری سنہ ۱۹۶۹ء

(ڈاکٹر) محمد صغیر حسن معصومی

دیباچہ

برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی ہے اور اس عرصے میں انہوں نے ملک کی جو خدمت کی اور جو تمدنی، سماجی، انتظامی اور ذہنی سرمایہ چھوڑا، وہ ہندوستان اور پاکستان کا قیمتی ورثہ ہے۔ خاص طور پر نظام عدل گستری کے جو نقوش مسلمان حکمرانوں نے چھوڑے ہیں، وہ کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ ۱۲۰۶ء سے جبکہ سلطنت دہلی قائم ہوئی جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء تک جو ۱۸۵۷ء میں واقع ہوئی، یہاں آٹھ سو سال مسلمانوں نے راج کیا۔ اس کے علاوہ شمال و جنوب میں بہت سی مملکتیں قائم ہوئیں اور ہر مملکت نے نظم و نسق کے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ عدل پر خاص توجہ کی اور اس کو بہت فروغ دیا۔ انصاف پرستی مسلمانوں کا خاص شعار رہا۔ سلاطینِ دہلی اور پھر دکن کی بہمنی سلطنت اور اس کی پانچ جانشین سلطنتوں کے زمانے میں عدلیہ کے جو خد و خال فراہم ہوئے ہیں، وہ بہت بصیرت افروز ہیں۔ لیکن اس موضوع پر اب تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا اور خصوصاً عہد مغلیہ کے قبل کا نظام عدل گستری تاریکی میں ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغلوں سے پہلے کے نظام عدل گستری پر روشنی ڈالی جائے۔

عدل گستری کو عربی زبان میں "قضاء" کہتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں "قضاء" کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے معینہ ادارے کی طرف سے قرآن و سنت اور شرعی احکام کی روشنی میں عوام الناس کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا جائے اور مقدمات فیصل کئے جائیں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ عربی زبان میں تاریخ قضاء پر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ بات یہ ہے کہ اسلامی علوم کی قدیم کتابوں کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ خاص طور پر بغداد اور اندلس کے کتب خانوں کے تقریباً سب کتابیں تباہ

Marfat.com

ہوگئیں۔ فاطمی حکومت کے بعد مصر کے کتب خانے بھی اجڑ گئے۔ قیاس یہ ہے کہ جس طرح مسلمان علما نے تمام موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اس موضوع پر بھی ضرور لکھا ہوگا لیکن وہ سرمایہ غور و فکر اب ناپید ہے۔ بہر حال نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت عربی زبان میں کوئی ایسی مستند کتاب موجود نہیں جس میں کسی مقام کے عدالتی نظام کی نشو و نما اور ارتقائی کیفیت کا حال درج ہو۔ ۱۹۳۴ء میں محمود بن محمد بن عرنوس، قاضی عدالت ہائے شرعیہ مصر نے "تاریخ القضاء فی الاسلام" لکھی اور غالباً یہ کتاب اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ لیکن اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ کتاب کی بحث زیادہ تر مصر سے مختص ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مختلف مذاہب یا مکاتب خیال کی کشمکش اور ان قاضیوں کے تذکرے بھرے ہوئے ہیں جو مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور اس میں عدالتی نظام کا اچھا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔

تاریخ قضاء تو نہیں البتہ عربی میں قاضیوں کے تذکرے ضرور مل جاتے ہیں۔ جو مختلف علاقوں میں قضاء کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر "اخبار قضاۃ" میں ابو عمر محمد بن یوسف بن یعقوب کندی المتوفی ۳۵۰ھ نے مصر کے قاضیوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے "رفع الاصر عن قضاۃ مصر" لکھی جس کو کندی کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ علامہ عسقلانی نے اپنی تصنیف میں ان تمام قاضیوں کے حالات درج کر دیئے ہیں، جو مصنف کے زمانے تک فائز خدمت ہوئے۔ اسی طرح امام جلال الدین سیوطی نے "حسن المحاضرۃ" میں ان تمام قاضیوں کا حال لکھا ہے جو فتح مصر سے لے کر مصنف کے زمانے تک قضاء کی خدمت پر مامور تھے۔ نیز ابو عبد اللہ محمد بن الربیع الجیزی، ابو العباس احمد بن مختبار الواسطی، ابو الحسن الموسوی الرضی اور جمال عبد اللہ البشبیشی نے مصری قاضیوں کے حالات قلمبند کئے ہیں جن کا تذکرہ عرنوس نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ قاضی عیاض "المدارک" میں لکھتے ہیں کہ قاضی ابو بکر بن حیان وکیع نے "تاریخ القضاۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جو اب چھپ گئی ہے۔

اسی طرح امام حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (المتوفی ۷۰۳ھ) کی کتاب "اخبار قضاۃ دمشق"، شیخ محمد جمیل آفندی الشطی کی جو ۱۱۶۳ھ میں دمشق کے قاضی مقرر ہوئے تھے "الفتح الجلی فی القضاء الحنبلی"۔ ابو الحسن علی الساعی البغدادی (المتوفی ۶۷۴ھ) کی "اخبار قضاۃ بغداد" ابو عبیدہ معمر بن المثنی کی "کتاب اخبار قضاۃ البصرہ"۔ ابو عبد اللہ بن حارث

الخشنی الاندلسی کی "القضاۃ بقرطبۃ" اور امام خلف بن عبد الملک المعروف بہ ابن بشکوال (المتوفی ۵۷۸ھ) کی "کتاب اخبار قضاۃ قرطبۃ" قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض مخطوطات کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ دمشق کے شیخ محمد جمال الدین القاسمی نے اسلامی فتاوی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو ۱۳۲۹ھ میں مطبعہ المقتبس دمشق میں طبع ہوئی۔

اردو زبان میں مولانا عبد السلام ندوی کی "القضا فی الاسلام" مطبوعہ اعظم گڑھ اور حاجی محمد بن عبد اللہ کی "النجم الثاقب فی قضیۃ علی بن ابی طالب" مطبوعہ حیدر آباد دکن (۱۳۱۶ھ) قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک اس برصغیر کا تعلق ہے مسلمانوں کے نظام عدل گستری پر اب تک کوئی سیر حاصل کتاب نہیں لکھی گئی۔ واحد حسین کی "اڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ دی مسلم رول ان انڈیا" مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۴ء اور محمد الدین [illegible] کی "اڈمنسٹریشن آف جسٹس آف مسلم لا" مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۶ء بہت ہی مختصر رسالے ہیں۔ مغلیہ عدل گستری پر بشیر احمد کی تصنیف "اڈمنسٹریشن آف جسٹس ان میڈیول انڈیا" موجود ہے جس سے اس موضوع پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اور قبل مغلیہ دور پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب "اڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی" ہے جو اس دور کے عام نظم و نسق پر اچھا تبصرہ ہے۔ لیکن اس میں عدل گستری سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس دور پر بھی ایک محققانہ اور سیر حاصل کام ہونا چاہیے اور اہل علم کے لئے جن کو اس دور سے دلچسپی ہو تحقیق کا وسیع میدان کھلا ہے۔

مغلیہ دور سے پہلے سلاطین دہلی اور سلاطین دکن کے عہد میں عدل گستری کا جو نظام رائج تھا وہ زیر نظر کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مواد کی فراہمی میں بے شمار کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ تاریخ، سوانح، ادب، فقہ، طبقات، فقہ، تفاسیر، احادیث، نیز ابن تیمیہ رحمۃ، ابن قیم رحمۃ، سرخسی، کتانی، قلقشندی، ماوردی وغیرہ جیسے مصنفوں کی تصنیفات کی ورق گردانی کرنی پڑی۔

اس کتاب کی تدوین جس کا آغاز دراصل ۱۹۴۵ء میں ہوا تھا۔ میں اپنے مشفق استاد ڈاکٹر حمید اللہ کا شکر گزار ہوں جو جامعہ عثمانیہ میں استاد قانون تھے۔ اور جو آج کل جامعہ پیرس میں ہیں۔ موصوف کی رہبری کے بغیر یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا۔

Marfat.com

اس کے علاوہ میں عم محترم پروفیسر عبدالمجید صدیقی سابق صدر شعبہ سیاسیات جامعہ عثمانیہ کا جو تاریخ ہند اور خاص طور پر تاریخ دکن کے بڑے ماہر ہیں، ممنون ہوں۔ موصوف کی عالمانہ رہنمائی اور نگرانی میں یہ پوری کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ نیز میرے کرم فرما مولوی خالد اسحاق صاحب سابق ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان و حال مشیر قانونی ادارہ تحقیقات اسلامی کے مفید مشوروں کو میں فراموش نہیں کر سکتا۔ ان مشوروں سے مجھے بہت فائدے پہنچے۔ کتاب کے آخری باب "تبصرہ" کی تکمیل موصوف ہی کے مشورے سے عمل میں آئی۔ آخر میں جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ناظم ادارۂ تحقیقات اسلامی بھی دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جن کے مفید مشوروں اور توجہ خاص کی بدولت یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

سیول سروس اکادیمی
لاہور

محمد عبدالحفیظ صدیقی
۱۹۶۷ء

اسلامی عدل گستری کے ماخذ

تاریخ ہند کا وسطی دور دراصل مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ ہے اور اس لئے وسطی دور کا نظام عدل گستری مسلمان حکمرانوں کے نظم و نسق کا ایک ضروری جزو ہے۔ گو قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے شمالی ہند اور دکن میں نظام عدل گستری کو اپنے خاص انداز میں ڈھالا اور اس میں جدید ماحول کے مطابق مناسب تبدیلیاں کیں لیکن اسے ٹھیٹ ہندوستان کی پیداوار سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ ادارہ بہت دور سے یہاں آیا تھا۔ اس کی پشت پر ایک تاریخ ہے اور اس کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل گستری کا اصلی سرچشمہ عرب ہے۔ اس کے بعد بغداد اور ترکستان میں اس کی پرورش ہوئی اور پھر ترکستان کے راستے سے یہ ہندوستان آیا۔ اسلامی عدل گستری کے ادارات پہلے ہی راستوں سے شمالی ہند آئے اور پھر خلجیوں اور تغلقوں کے ذریعہ دکن پہنچے۔ دکن کی سرزمین پر پہلے پہل صدہ سلطنت بہمنی اور پھر بیجاپور، احمد نگر، برار، بیدر اور گولکنڈے کی سلطنتوں نے عدل گستری کے ان ادارات سے اپنے نظم و نسق کو آراستہ کیا اور تفصیلی حیثیت سے ان میں بہت سے اضافے کئے۔ اگرچہ سلاطین دہلی اور خصوصاً سلاطین دکن کا نظام عدل گستری ہمارا موضوع بحث ہے لیکن اس کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی عدل گستری کا اصلی سرچشمہ کیا ہے؟ خلفاء راشدین، بنو امیہ اور بنو عباس کا اس میں کس قدر حصہ ہے۔ پھر شمالی ہند آنے کے بعد اس میں کیا تبدیلیاں اور اضافے ہوئے۔ اور دکنی ماحول میں اس کی کیا صورت گری ہوئی؟ -

Marfat.com

مملکت، حکومت اور اقتدار اعلیٰ:-

چونکہ عدل گستری کی تمام قانون، اقتدار اعلیٰ اور مملکت سے پھوٹتی ہیں اور جب تک قانون، اقتدار اعلیٰ اور مملکت کے صحیح تصورات روشنی میں نہ آجائیں، عدل گستری کی ماہیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسلامی عدل گستری کی وضاحت سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مملکت، اقتدار اعلیٰ، قانون اور حکومت کے متعلق اسلام کا حقیقی تصور کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی اسلامی مملکت عہد نبوی میں قائم ہوئی اور یہ ایک نئے تصور حیات اور ایک بلند نصب العین کے ساتھ قائم ہوئی۔ اس کا اولین مرکز مدینہ تھا جہاں مکے کے مہاجر، مدینے کے مسلمان اور مدینے کے غیر مسلم عرب اور یہودی قبیلے سب ہی اس مملکت میں شامل ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چار طبقوں سے مل کر جو سیاسی تنظیم قائم کی تھی، اس کی نوعیت ایک وفاقی شہری مملکت کی سی تھی۔ حسن اتفاق سے اس کا دستور تحریری شکل میں محفوظ رہ گیا۔[1] یہ اسلام کا پہلا سماج اور پہلی مملکت ہے جو سیاست کے بلند تصورات کے ساتھ قائم ہوئی۔ اس کے سیاسی اعضاء ہم آہنگ کئے گئے اور افراد مملکت کو ایک سیاسی رشتے میں منسلک کیا گیا۔ اس کی ابتداء مدینہ سے ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ تمام جزیرہ نمائے عرب اس تنظیم کے تحت آگیا اور خلیفہ سوم کے زمانے تک اسلامی مملکت بحر خزر اور افریقہ تک پہنچ گئی۔

قرآن، حدیث، فقہاء کے اجتہاد اور صدیوں کے عملدرآمد کو دیکھا جائے۔ تو مملکت کی ابتدا کے متعلق اسلام کا یہ تخیل معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تشکیل ایک سماجی ضرورت پر مبنی ہے اور بغیر مملکت کے معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔[2] چنانچہ علامہ ماوردی فرماتے ہیں۔ "تمام ارباب خرد فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور باہمی مخاصمت میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر ذی اقتدار افراد نہ ہوں تو عالم میں شخصی اقتدار پھیل جائے اور تہذیب و اجتماع کا شیرازہ بکھر جائے۔"

---

[1]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر حمید اللہ "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴۳ء نیز ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام (طبع گاٹن جن ۱۸۶۰ء) ۳۴۱ - ۳۴۴

[2]: پروفیسر عبد المجید صدیقی۔ تاریخ سیاسیات ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۳۸ -

یہ تو مملکت کی ابتداء ہوئی۔ اب رہا مقصد تو اس کے متعلق ماوردی فرماتے ہیں "دین کی حفاظت ہو اور دنیا کا انتظام بہ قرار رہے"[2] دوسرے الفاظ میں مملکت کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ انسان ایک سماجی اور عمرانی ضرورت محسوس کرے کہ جماعت انسانی میں ضبط و نظم قائم رہے۔ مقصد سے متعلق دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک دین کی حفاظت، دوسرے دنیا کا انتظام۔ اسلام کے سیاسی تصور کے مطابق یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام میں مذہب اور سیاست جداگانہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ [illegible] ایسی ہی ضروری چیز ہے جیسے سماجی قوانین اور اصلاحی نظام [illegible]

ہوتا ہے کہ مملکت کے تصور میں اخلاقیات کو مادی [illegible] افلاطون کی طرح اسلام بھی سیاسیات کو اخلاق کے تابع قرار دیتا ہے۔ اور مملکت کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے اخلاق سنوارے۔ اس کے علاوہ اسلام کی مملکت عالمگیر تصور رکھتی ہے جس میں ہر قوم نسل اور آبادی بلا امتیاز رنگ و نسل سما سکتی ہے۔ یعنی اسلامی مملکت جغرافی و نسلی حدود سے بالاتر ہے۔ اسی وجہ سے اسلام میں مملکت و سلطنت کی اصطلاح سرے سے نہیں پائی جاتی کہ اس میں نسلی و جغرافی لزوم آ جاتا ہے۔ بلکہ اسلام نے مملکت کے لئے امت کی اصطلاح استعمال کی ہے جو اپنے وسیع معنوں میں ایک اسلامی اخوت ہے۔[3]

مملکت کے بعد اقتدار اعلےٰ کا مسئلہ ہے۔ [illegible] اقتدار اعلےٰ کا ماخذ ربانی ہے [illegible] دستور کے تحت اسلامی مملکت قائم ہوئی اور [illegible] اقتدار [illegible] جانب اللہ [illegible] لیکن یہ اقتدار خود انسان استعمال کرے اور [illegible] اقتدار ان کو قدرت [illegible] ہے۔ اس طرح یہ انسانی ہے۔ یہ اقتدار پہلے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ [illegible] چنانچہ بیعت عقبہ میں اہل مدینہ نے جناب رسالت مآب کی [illegible] اقتدار کو دل سے قبول کر لیا۔ لیکن خلافت راشدہ کے دور میں اقتدار اعلےٰ [illegible] میں منتقل ہو گیا اور یہ حیثیت صرف اہل مدینہ کو حاصل تھی [illegible] کو بہ حیثیت [illegible] استعمال ہوتی

---

[1] ماوردی۔ احکام السلطانیہ (ترجمہ اردو) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء صفحہ (۳)
[2] ایضاً صفحہ (۳)
[3] تاریخ سیاسیات نواب صدر صفحہ ۱۰۵)۔

تھی اور خلیفہ کا انتخاب اسی مشیت کے مطابق ہوتا تھا۔ انتخاب کرنے والے اہل اختیار اور خلافت کے امید وار اہل امت کہلاتے ہیں[1] امامت کے لئے بعض مرتبہ نامزدگی بھی ہوئی۔ یعنی خلیفہ اپنی طرف سے کسی امید وار کو نامزد کر دیتا تھا۔ لیکن یہ نامزدگی کافی نہ تھی بلکہ رائے عامہ سے اس کی توثیق ضروری تھی یہ توثیق جو افراد مملکت کی رائے دہی سے ہوتی تھی۔ بیعت کے نام سے موسوم ہے۔ خلفاء راشدین نے اس بات کا صاف اعلان کیا تھا کہ اگر وہ خدا اور رسول کے احکام کی پابندی نہ کریں تو ان کو خدمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ گویا منتخب خلیفہ کے ساتھ جب تک مشیت عامہ ہوتی۔ وہ خلیفہ رہ سکتا تھا۔ خلیفہ صرف صدر عاملہ تھا اور اس کو قانون سازی یا عدل گستری سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ قانون سازی اور تعبیر و قیاس فقیہوں کے ہاتھ میں تھی اور عدلیاتی اختیار قاضی استعمال کرتے تھے۔

مسلمانوں کے سیاسی تصور میں مملکت اور حکومت کا واضح فرق نہیں پایا جاتا۔ مسلمان مفکر امت سے مملکت مراد لیتے ہیں اور خلافت سے حکومت۔ خلافت کے اعضا میں خلیفہ اور اس کی مجلس عاملہ مقننہ یعنی فقہا اور عدلیہ یعنی قضاۃ شامل تھے۔ اسلامی حکومت کے یہ تینوں اعضا معین تھے۔ اور ایک دوسرے کے اختیارات میں مداخلت نہیں ہوتی تھی۔ گویا یہ کہنا چاہیئے کہ تفریق اختیارات کا یہ تصور مانٹسکیو سے ایک ہزار سال پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ مسلمان مفکروں نے حکومت کی قسمیں نہیں بتائیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں صرف ایک ہی طرز حکومت جمہوریت تھی۔ لیکن بعد کے زمانے میں حکومت کی مختلف صورتوں کا تجربہ ہوا۔ چنانچہ شروع عہد کی جمہوریت کے بعد بنی امیہ کے دور میں اعیانیت داخل ہو گئی۔ جس میں اعیان خاندان حکومت کرتے تھے۔ بنی عباس کے زمانے میں شخصی اعیانی و عمومی تینوں عناصر مخلوط ہو گئے۔ اور انگلستان کے دستوری بادشاہوں کی طرح خلفاء بھی دستوری ہو گئے۔ چنانچہ خلیفہ کے عاملانہ اختیارات وزراءِ تفویض استعمال کرتے تھے۔ جس میں خلیفہ مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس استعمال میں بھی وہ قوم کے سامنے ذمہ دار تھے۔ ان کو ہمیشہ اجماع امت کا ڈر تھا۔ اس کے علاوہ جب وزیرِ تفویض برخاست ہوتا تو اس کے ساتھ اس کے تمام ماتحت وزراء

---

[1] ماوردی محولہ صدر ص (۴) تیز حسن المساعی الی نصح الرعیتہ والراعی۔ مطبع احمدی حیدر آباد ص ۱۸ ۔

بھی برخاست ہو جاتے تھے - یہ نظام کابینہ کی صورت تھی - اس میں ذمہ داری کا بڑا پہلو مضمر تھا - اسلام میں خلافت ہو یا چھوٹی چھوٹی سلطنتیں شخصی اور جابرانہ حکومت کا تصور نہیں ہے کیونکہ اسلامی حکومت تفریق اختیارات کی تابع ہے - خلیفہ یا بادشاہ صرف عاملانہ عہدہ دار ہے جو نہ قانون بنا سکتا ہے اور نہ عدلیاتی اختیار رکھتا ہے - اس طرح اسلامی حکمران شخصی یا جابر حکمران نہیں ہو سکتے [۱] "

اسلامی تصور قانون و عدل :-

اسلامی قانون کے اصل ماخذ جس میں قانون دستوری اور قانون ملک دونوں شامل ہیں قرآن اور حدیث ہیں اور یہ ربانی ماخذ ہیں - لیکن مرور زمانہ کے ساتھ اس میں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کا عمل بھی شامل ہو گیا اس کا مرجع اسلامی قوانین کے اساسی سرچشموں یعنی الکتاب والسنتہ پر مشتمل تھا - نیز امت کو خدا کی طرف سے قیاس کا جو حق عطا ہوا ہے، اس کے ذریعہ بھی قانون سازی ہوتی رہی اور جو نتائج اس سے پیدا ہوتے تھے ان کو اپنی عملی زندگی میں شریک کر کے مسلمان ان کی توثیق کرتے تھے - اسی طرح اجماع بھی اسلامی قانون کی ایک اہم بنیاد ہے - جس کے ذریعہ سے ایسی باتوں کو اتفاق کی قوت سے قانون کا قطعی جزو بنا دیا جاتا ہے جن کے ثبوت میں کچھ ابہام ہو - اس سے ظاہر ہے کہ مشیئت عامہ اسلامی قوانین کے نفسفہ میں منجملہ دیگر مؤثرات کے ایک بڑا اہم مؤثر ہے - یوں تو فقہا ہی اسلام کے قانون ساز سمجھے جاتے ہیں جو قرآن و حدیث کی صحیح تعبیر و توضیح اور تاویل کرتے ہیں - لیکن غور سے دیکھا جائے تو کسی ایک فقیہ کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس فیصلے سے جمہور علماء کا اتفاق ضروری ہے - اور علماء کے پیچھے مشیئت عامہ ہوتی ہے یعنی امت اپنی طرف سے فقہا کو اجتہاد کا حق دیتی ہے آئمہ اجتہاد میں سے جن بزرگوں کے فیصلوں کو مسلمانوں نے عموماً تسلیم کیا ہے، ان ہی کے اجتہادی نتائج قابل تسلیم قرار دیئے گئے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان فقہی قوانین میں جو اہمیت پیدا ہوئی اس میں مسلمانوں کے عام اتفاقی رجحانات کو بھی دخل ہے - بہر حال علماء کے پیچھے یقیناً مشیئت عامہ بھی ہوتی ہے یعنی امت اپنی طرف سے فقہاء کو اجتہاد کا حق دیتی ہے [۲] اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اساسی احکام کے علاوہ جنہیں ربانی کہنا چاہیئے

---

[۱] :- تاریخ سیاسیات محولہ صدر صفحہ (۱۴۴)

[۲] عبدالحفیظ صدیقی: اسلامی عدل گستری ۔ ۱۹۴۷ء ۔ ص ۱۸

Marfat.com

مرورِ زمانہ کے ساتھ اس مشیئت عامہ کے زور سے فقہ میں ایک زبردست ارتقا ہوا[۱]۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں قوانین اسلام کا جو مجموعہ ہے وہ اسی ارتقا کا نام ہے۔ اسلامی قانون یعنی شریعت اخلاقی وجوب اور فرائض پر بھی زور دیتا ہے اور مسلمانوں کی مذہبی اور گھریلو زندگی کے علاوہ ان کی سیاسی اور معاشری زندگی کے تمام شعبوں پر بھی حاوی ہے چنانچہ شریعت میں مذہب اور مذہبی فرائض سے متعلق احکام کے علاوہ افراد ملت کے باہمی تعلقات اور ضبط و نظم کے بھی احکام ہیں۔ نیز انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق بھی تفصیلی قواعد اور اصول پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی کے ارتقا میں زندگی کی ضروریات کو نمایاں جگہ دی گئی اور "اصل نقطہ" محض ایک ثانوی چیز بن کر رہ گئی[۲]۔ اس کے باوجود شریعت ایک مقدس قانون ہے جو خاص طور پر قانون تفقہ[۳] کہلا سکتی ہے[۴]۔

(اگرچہ ہر قوم اور ہر تہذیب میں انصاف کا کچھ نہ کچھ تصور موجود ہے لیکن یہ تصور ہر زمانے میں اور ہر جگہ ایک نہیں رہا۔ بلکہ ہر قوم اور ہر زمانے نے "عدل" کو ایک خاص تخیل اور زاویہ نگاہ سے دیکھا اور ہر زمانے میں "سزا" کا معیار جداگانہ رہا۔ جس طرح ہر زمانے میں اخلاق کا معیار، سماجی برائیوں کو جانچنے کے ڈھنگ اور سیاسی خرابیوں کو دور کرنے کے طریقے مختلف رہے ہیں۔ اسی طریقہ سے عدل و سزا کے معیار بھی مختلف ہیں۔ اسلام نے قرون وسطیٰ میں انصاف اور

---

[۱] :۔ فقہ کے اس تدریجی ارتقا کے لئے ملاحظہ ہو مصر کے علامہ خضری کی "تاریخ التشریع الاسلامی" جس کا "تاریخ فقہ اسلامی" کے نام سے اردو ترجمہ عبد السلام ندوی اعظم گڑھ ۱۳۴۲ھ نے کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو
ڈاکٹر آغنیدس۔ این۔ پی۔ محمڈن تھیوریز آف فائننس۔ نیو یارک
۱۹۱۶ء۔ جزو اوّل ص ۲۳ – ۱۵۶ – اور
خان ہمیر ان انسائیکلوپیڈیا۔
جس میں اس پورے نظام قانون پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ نیز ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس جلد ۸ ص (۳۴۴) ڈاکٹر حمید اللہ۔ امام ابوحنیفہ کی تدوین فقہ اسلامی حیدرآباد ۱۹۴۳ نیز دیکھئے جوسف شناخت، کولسن ولسن۔ عبد الرحیم وغیرہ۔

[۲] – JURIDICAL

[۳] :۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس جلد ۸ ص (۳۴۴) [۴] جیورس لاء۔

[۵] :۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس جلد ۸ ص (۳۴۴)

عدل سے متعلق جو تصور پیش کیا، وہ دنیا کے لئے بالکل انوکھا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا سلطان سرچشمۂ انصاف نہیں بلکہ پوری مسلم جماعت ہے اور انصاف صرف اللہ کے نام سے کیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام نے عدل گستری کو مملکت کا اولین اور ضروری فرض قرار دیا۔

کتاب اللہ میں عدل کا جو تصور دیا گیا ہے وہ ذیل کی چند آیتوں سے واضح ہو سکتا ہے۔

(۱) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان یعنی اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

(۲) ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یعنی کسی کے بغض کی وجہ سے نا انصافی پر آمادہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ عدل کرنا چاہیئے جو پرہیزگاری کا تقاضا ہے۔

(۳) وجزاء سیئة سیئة مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔ (۴۲ - ۴۰)

یعنی برائی کا بدلہ اسی قدر برائی سے دیا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور صلح کر لے تو خدا اس کا اجر دے گا۔

(۴) وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما... ان اللہ یحب المقسطین۔ (۹،۴۹)

یعنی جب مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں ان میں آپس میں صلح کرا دو اور اگر ان میں سے ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتی ہے تا آنکہ وہ اللہ کے حکم ماننے پر اتر آئے اور اگر وہ اس پر اتر آئے تو پھر ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور درمیانہ روی کے ساتھ عمل کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

(۵) یاداود انا جعلنک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ (۳۸ - ۲۶) یعنی اے داود ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اس لئے تم لوگوں کے درمیان حق پر فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی مت کرو کیونکہ اس سے تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

(۶) سب سے اہم آیت اس باب میں یہ ہے۔ یآیھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط... یعملون خبیرا (النساء - آخر) یعنی اے ایمان والو انصاف پہ قائم رہو۔ اللہ کی طرف گواہی دو اگرچہ اپنا یا ماں باپ یا قرابت والوں کا نقصان ہو۔ اگر کوئی غنی یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے۔ اس لئے تم اپنے جی کی بات نہ مانو۔ اگر تم بات بدل ڈالو یا کسی کو بچانے کی کوشش کرو تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

Marfat.com

قرآنی تصور[1] کے بعد جناب رسالت مآب صلعم کا تصور عدل قابل غور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے سلطان کو زمین پر ظل اللہ بتایا۔ اگر سلطان انصاف کرے تو اللہ کے نزدیک اس کا اجر ہے اور ظلم کرے تو سلطان پر اس کا بوجھ ہے[2]۔ حضرت عائشہ نے جناب رسالت مآب صلعم کا یہ قول بیان فرمایا کہ سایہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ لوگ جائیں گے جو اپنا حق ملنے پر اسے قبول کر لیتے ہیں اور دوسروں کا حق بخوشی دے دیتے ہیں[3]۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے یہ قول بیان فرمایا کہ اللہ کے محبوب لوگوں میں حکام عادل ہیں اور مبغوض تر قیامت میں اور سخت عذاب والے ظالم ہیں[4]۔ ابوسعید اور طارق بن شہاب سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم کے خیال میں سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ایک شخص کسی حاکم جابر کے سامنے حق اور انصاف کی بات کہنے سے نہ چوکے[5]۔ ایک اور حدیث یہ ہے کہ جب انسانوں کے معاملات کسی کے سپرد ہوں اور وہ مسلمانوں یا مظلوموں کے لئے اپنا دروازہ بند کر دے تو خدا اس پر بھی اپنے رحم کا دروازہ بند کر دے گا[6]۔ ایک اور حدیث مشہور ہے کہ ایک منٹ جو انصاف میں صرف ہو ستر سال کی عبادت و ریاضت سے بہتر ہے[7]۔ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ منصف اور عادل حکام خدا سے بہت قریب ہوں گے[8]۔ عبداللہ بن اوفی نے سرکار دو عالم صلعم کا یہ قول بیان فرمایا کہ حاکم جب تک ظلم نہ کرے اس وقت تک اللہ اس کے ساتھ رہتا ہے، اور جب

---

[1] قرآن حکیم کی دیگر آیتیں بھی ملاحظہ ہوں (۲: ۱۶۶ و ۶۵-۲۲: ۲ و ۲۸۳: ۲ و ۱۴ و ۲: ۲۸۲ و ۲۲: ۳۰-۲۵-۴۲ وغیرہ

[2] مشکوٰۃ شریف بحوالہ محمد بن عبداللہ، حبل المتین (حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ) صفحہ (۸)۔

[3] " " " " صفحہ (۹)۔

[4] جامع ترمذی صفحہ (۹)۔

[5] مرزا ابوالفضل۔ SAYINGS OF THE PROPHET MUHAMMAD

[6] " صفحہ (۸۹) حدیث (۳۶۷)۔

[7] ماخوذ نہایۃ العرب۔

[8] بخاری و مسلم۔

Marfat.com

حاکم ظلم کرتا ہے۔ اللہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور شیطان اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔[1] بریدہؓ سے ایک حدیث روایت ہے کہ حاکم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ جنت میں جائیں گے۔ دوسرے وہ جو حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فیصلے غلط اور لوگوں کے حق کے خلاف کرتے ہیں۔ یہ دوزخ میں جائیں گے۔ تیسرے وہ لوگ جو لوگوں کے معاملات کے فیصلے ناواقفیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ بھی دوزخ میں جائیں گے۔ عبداللہ بن عمرؓ اور ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب حاکم عدالت فیصلہ کرتا ہے اور اپنے فیصلے کے لئے کافی غور کرتا اور صحیح نتیجہ پہنچتا ہے تو اس کے لئے دو انعام مقرر ہیں۔ اور وہ کافی غور کے باوجود اپنے فیصلے میں غلطی کرے تو اس کے لئے ایک انعام ہے۔[2] حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب تمہارے پاس دو فریق فیصلے کے لئے آئیں تو دونوں سے پورے حالات سنے بغیر فیصلہ مت کرو۔[3] حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب قاضی غصہ کی حالت میں ہو تو اسے فیصلے نہیں کرنا چاہیئے۔[4]

غرض قرآن اور حدیث میں عدل و انصاف سے متعلق اس طرح کے بیسیوں احکام اور ہدایتیں ملتی ہیں۔ ان کا نچوڑ صرف یہ ہے کہ حاکم عدالت کو چاہیئے کہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر کافی غور اور تحقیق کے بعد فیصلہ کرے۔ عدل گستری کو انسانی فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ انصاف کے لئے معاوضہ لینے کا حکم نہیں ہے۔ کھلی عدالتی کارروائی پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں جو احکام بتائے گئے ہیں، ان کے مطابق فیصلے ہوتے چاہئیں۔ نیز عرف اور عادت اور انصاف کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو قرآن و حدیث اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے افلاطون کے "عدل مطلق" کو حقیقی معنوں میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ بنتھم کے اس خواب کی کہ عدل گستری مفت ہونی چاہیئے، صدیوں پہلے کی تعبیر ہے۔

مملکت۔ اقتدار اعلیٰ۔ حکومت۔ قانون اور عدل کے متعلق اسلامی تصورات کا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلامی عدل گستری کی سوتیں کہاں سے نکلتی ہیں:۔

---

[1]۔ جامع ترمذی بحوالہ سبیل المتین مجولہ صدر ص ۹

[2] تا [4] عبدالحفیظ صدیقی: اسلامی عدل گستری۔ ص ۲۴ (بحوالہ بخاری، مسلم، ترمذی)

اسلامی عدل گستری کے ماخذ

اسلامی عدل گستری کے ماخذوں میں سب سے پہلے زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج ہیں۔ کیونکہ اسلام میں زمانہ جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا ہے[1]۔ جاہلیت کے فضائل ایک طرح سے اسلامی عدل گستری کے ماخذ ہیں اس لئے اسلامی عدل گستری کے سلسلے میں زمانہ جاہلیت کے نظام عدل گستری کا مطالعہ لازمی ہے۔

(۱) عدل گستری زمانہ جاہلیت میں :-

اسلام سے پہلے عربوں میں عہدیت[2] کا ایک نظام پایا جاتا تھا۔ اسے مختلف خانہ بدوش قبیلوں کے باہمی میل جول کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں "مملکت" کا ابھی تک وجود تھا اور نہ عدل گستری کے لئے کوئی منظم حکومت قائم تھی۔ حکومت اصل میں عام عملدرآمد اور رسم و رواج کا نام تھی۔ اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مناقشوں کا تصفیہ بھی قدیم رسم و رواج کے تابع تھا۔ قبیلوں میں بعض مرتبہ سبھائیں منعقد ہوتی تھیں اور ان کے متعلق یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ جدید قانون بناتی ہوں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قانون سازی نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ قدیم اور زیادہ تر رسم و رواج کی پابندی کرواتی تھیں۔ اس رسم و رواج کے پیچھے قبائلی رائے عامہ ہوتی تھی اور یہی وہ اخلاقی قوت تھی جسے زمانہ حال کی اصطلاح میں تہدید (SANCTION) کہنا چاہیئے۔ اس طرح قدیم عربوں میں عدلیہ اور عاملہ کے چند دھندلے سے ادارے تو مل جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں ایسا کوئی ادارہ قانون سازی نہ تھا جس کو مقننہ کہہ سکیں اور یہ کمی اسلام نے پوری کی۔

عرب زمانہ جاہلیت میں عدل گستری کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ عربی زبان میں "حکمرانی" اور "فصل خصومات" کے لئے ایک ہی لفظ یعنی "حکم" استعمال ہوتا ہے۔ اس میں حکومت اور عدل گستری کے دونوں پہلو مضمر ہیں اور اس سے عربوں میں عدل گستری کی اہمیت کا اندازہ

---

[1] یا سائب انظر اخلاقک التی کنت تصنعها فی الجاهلیة فاجعلها فی الاسلام
یعنی اے سائب۔ ان اچھے اخلاق کی پابندی کرو جن کو تم ایام جاہلیت میں پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کو اسلام میں بھی روا رکھو۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ طبع حیدرآباد۔ ۱۳۱۳ھ صفحہ ۴۲۵۔

[2] کنفیڈریشن۔

ہوتا ہے۔ طلوع اسلام سے عین قبل مکہ میں ایسے رجحانات پائے جاتے تھے جن کو منظم حکومت کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ شہر میں مستقل رہائش رکھنے والے مختلف قبیلے تھے اور مختلف خاندان ذی اثر قبیلوں یا خاندانوں میں تقسیم ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک قبیلہ کے سپرد تنازعات کا تصفیہ تھا اور سردار قبیلہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے بھی یہ خدمت انجام دی تھی۔ اگر ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلے کے آدمی کی جان لے لے تو مجرم کو قتل کیا جاتا تھا۔ مجرم کو قتل کرنے کا حق مقتول کے ورثاء یا سردار قبیلہ کو پہنچتا تھا۔ لیکن جرمانہ یا ایک سو اونٹوں کے معاوضہ پر راضی نامہ بھی ہو سکتا تھا۔ چند آدمیوں کے قسم کھانے پر کہ مجرم نے قتل نہیں کیا، معاملہ ختم کیا جاتا تھا۔ جرائم کی بہت سخت سزائیں مقرر تھیں، چوروں کے ہاتھ کاٹنا سرقے کی عام سزا تھی۔ زانیوں کو سنگسار کیا جاتا تھا یا ان کے چہرے سیاہ کئے جاتے اور پھر ان کو کوڑے لگائے جاتے۔ معمولی مضرتوں کے لئے خون بہا طلب کیا جاتا تھا۔[1] لیکن عرب جاہلیت جنسی تعلقات اور وراثت سے متعلق کوئی معین اصول نہ تھے۔[2] طلاق کے مختلف طریقے رائج تھے۔ لیکن اس کے متعلق بھی کوئی واضح اصول نہ تھا۔[3] مدعی سے ثبوت طلب کیا جاتا اور مدعی علیہ کو قسم دی جاتی تھی۔ اسلام نے جاہلیت کے بعض رسم و رواج سے فائدہ تو اٹھایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے صرف ان رسوم سے استفادہ کیا جو بالکل قرین عقل اور قرآنی احکام کے مطابق تھے۔[5] لیکن جو عقل سلیم اور پاکیزہ ضمیر کے خلاف تھے وہ سب ترک کر دیئے گئے۔

عام طور پر انصاف کرنے کے عرب میں تین طریقے تھے (۱) ایک طریقہ تو پنچوں کا تھا۔ ...

---

۱ ولہازن بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱ شمارہ (۱، ۲) ۱۳۴۸ فصلی ص ۱۷

۲ محمد اللہ صفحہ (۱۱)۔ تفسیر احمدی طبع بمبئی ص ۵، کشف الغمہ جلد (۲) طبع مصر صفحات ۱۰۵، ۱۰۶

۳ MUHAMMAD ULLAH, THE MUSLIM LAWS OF MARRIAGE

۴ الفاصفحہ (۶۶)

۵ وانما ینظر الی المتعارف لان الثابت عرفا کالثابت شرعا۔ یعنی جو بات رسم سے ثابت اور معین ہو جائے وہ شرع میں ویسی ہی اہمیت رکھے گی (فتاوی قاضی خان کے حوالے سے محمد اللہ ص ۱۰۰)

خصومات کے لئے قبیلہ وادی پنچ مقرر ہوتے تھے - ان کے سامنے فریقین حاضر ہوتے - اپنا مقدمہ پیش کرتے اور پنچ کا فیصلہ قطعی ہوتا تھا - بالعموم یہ کوشش ہوتی تھی کہ جرم کو "دفن" یعنی محو کر دیا جائے تاکہ انتقام کا جذبہ ابھرنے نہ پائے[1]

(۲) پیچیدہ مقدمات میں کاہنوں سے رجوع کیا جاتا تھا، جو مذہبی پیشوا یا علم غیب کے مدعی تھے چنانچہ شق اور سطیح دو مشہور کاہن تھے - (الف) قصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کاہن بعض دفعہ بیانات سننے سے پہلے ہی صحیح فیصلہ گنگناتے تھے[2] کاہنوں کے فیصلوں کی تعمیل کرانے کے لئے کوئی عاملانہ طاقت تو نہ تھی - لیکن لوگوں کے توہمات ہی تہدیدیہ کا کام کر جاتے تھے - گو کاہنوں کی نجی حیثیت ہوتی تھی - لیکن جھگڑوں اور قانونی مسائل میں وہ "قانون گو" کا کام دیتے تھے - اسی وجہ سے کاہن اور حکم کے مفہوم میں بہت کم فرق سمجھا جاتا تھا الحطیہ نظم، ابیت میز، اور الالتبہی مطبوعہ قاہرہ ۱۲۳۲ھ ج ۲ صفحہ ۳۰، ان کے فیصلوں کو ایک طرح سے خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا جن کے خلاف مرافعہ کا چارہ کار نہ تھا[3]

زمزم کا مشہور اور تاریخی واقعہ ہے کہ چشمہ دوبارہ دریافت ہونے کے بعد اس کی ملکیت کا جھگڑا پیدا ہوا تو عبدالمطلب اور دوسرے اکابر مکہ ایک کاہن کے پاس گئے - عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت کی تھی - اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ایک کاہنہ سے رجوع کیا تھا[4]

(۳) تیسرا ادارہ "تحکیم" تھا - یعنی بعض شخصیتیں ثالث یا حکم کا کام کرتی تھیں - چنانچہ ایام جاہلیت کا ایک مشہور حکم عامر بن ظرب العدوانی تھا - اس کے پاس ہر جگہ سے تحکیم کے

---

[1] صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج (۳) مطبع امیریہ قاہرہ ۱۹۱۸ء صفحہ (۳۵۲)
(وطریقتھم فیہ ان تجتمع اکابر قبیلۃ الذی یدفن بحضور رجال یثق و بھم المدفون لہ) -

[2] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۱۹) - (ماخوذ از ابن کثیر وغیرہ)

[3] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - لفظ کاہن -
الف - ابن ہشام سیرۃ سیدنا محمد رسول اللہ (طبع گاٹن جن ۱۸۶۰ء) -

[4] ڈاکٹر حمید اللہ - ص ۲۰ -

لئے مقدمے والے آتے تھے[1]۔ قبیلہ تمیم کے سردار موروثی طور پر پورے عرب کے حکم مانے جاتے تھے[2]۔ یہ سردار کسی بڑے میلے کے موقع پر حکم مقرر ہوتے تھے۔ مثلاً عکاظ کے میلے میں یہ سردار دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان فیصلوں کی خلاف ورزی میں رسوائی اور بدنامی کا ڈر ہوتا تھا۔ اور یہی تہدید تھی۔ غرض اس طرح کے بہت سے موروثی حکم عدل گستری میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا ذکر اکثر مؤرخوں نے کیا ہے۔ ابن قتیبہ کے حوالے سے بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ غیلان بن سلمہ ثقفی ہفتہ میں ایک دن اپنے ذاتی معاملات میں مصروف رہتا۔ ایک دن شاعری کے جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن حکم بن کر جھگڑے چکاتا[3]۔ قبیلہ واری حکم بھی ہوتے تھے۔ وقتی طور پر بھی کسی کو حکم بنا لیا جاتا تھا چنانچہ قصی اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک شخص یعمر بن عوف کو حکم بنایا گیا تھا[4]۔

ان تین طریقوں کے علاوہ ایک اور غیر معمولی طریقہ بھی زمانہ جاہلیت میں پایا جاتا تھا۔ شہر مکہ میں "حلف الفضول" کا ایک ادارہ قائم تھا جس سے زمانہ جاہلیت کی [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ حرب فجار کے بعد یہ ادارہ پھر زندہ ہوا۔ یہ ایک اجتماعی حلف تھا۔ اس کی ایک تاریخ [illegible] یہ ہے کہ خود جناب رسالت مآب صلعم نے بعثت سے قبل اس میں حصہ لیا تھا۔ یہ درحقیقت ایک رضاکار جماعت کا مجموعہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ شہر کی حدود میں جو مظلوم پائے جائیں ان کی مدد کی جائے اور ظالم کو سزا دی جائے[5]۔ آنحضرت صلعم نے نبوت کے بعد بھی [illegible] حصہ لیا اور اس پر آپ کو فخر تھا۔ یہ رضاکار جماعت بنی امیہ کے عہد کی ابتدا تک [illegible] پر کام کرتی رہی۔

بہرحال یہاں اس زمانے کا تذکرہ ہے جبکہ عرب میں اسلام کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے لئے ہمیں قیاس آرائی سے کام لینا پڑتا ہے۔

---

[1] ابن ہشام بحوالہ صدر صفحہ (۸۰، ۹۰)

[2] قال ابو المنذر وتزعم مضران امر الموسم وقضاء عکاظ فی بنی تمیم مرزوقی بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ ۱۰

[3] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۲۰)

[4] ابن ہشام بحوالہ صدر صفحہ (۹۰)۔

[5] ابن ہشام بحوالہ صدر صفحہ (۸۵-۸۷) مسند احمد ابن حنبل جلد ۱

Marfat.com

یہ مختصر سا نظام جو اسلام سے پہلے پایا جاتا تھا اور جسے صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا۔ بعض نظیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض طاقتور قبیلے اپنے رکن قبیلہ کا خون بہا معمولی قبیلے کے رکن سے دگنا لیتے تھے۔[1] کسی آزاد شخص کا قاتل غلام ہو تو غلام کے علاوہ مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر بدل میں طلب کیا جاتا تھا[2] اس قاعدے کو اسلامی دور میں قرآن نے منسوخ کر دیا۔[3]

انصاف رسانی کے ان مختلف طریقوں کے باوجود زمانہ جاہلیت میں کسی مرکزی حاکم عدالت کا پتہ نہیں چلتا۔ وکیل وغیرہ نہ تھے۔ فریقین بذات خود انصاف چاہتے تھے۔ سب سے بڑی کمزوری اس نظام کی یہ تھی کہ تہدید صرف رائے عامہ پر موقوف تھی اور جب ملزم قبیلے کے دسترس سے باہر ہوتا تو ان کے ہاتھ میں صرف یہی حربہ تھا کہ ملزم کو "طرد" یعنی ذات برادری سے باہر کر دیا جائے۔

(۲) عدل گستری زمانہ رسالت میں :-

اسلامی عدل گستری کا دوسرا بڑا امتیاز جناب رسالت مآب صلعم کا مبارک عہد ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں زمانہ جاہلیت کے تمام ادارے اور رسم و رواج معطل قرار دیئے گئے۔ اور ۶۱۰ء سے جب اسلام کا ظہور ہوا، عرب میں ایک عالم گیر تحریک پیدا ہوئی اور دنیا کے لئے نیا تصور حیات پیش کیا گیا۔ یوں تو مکہ ہی میں ایک اسلامی سماج بن گیا تھا لیکن وہ مملکت نہ تھی۔ آنحضرت صلعم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو اسی وقت سے اسلامی مملکت کی بنیاد پڑی[4] جس دستور پر اس اسلامی مملکت کی تشکیل ہوئی، خوش قسمتی سے اس کا اصل متن لفظ بہ لفظ اب دستیاب ہو گیا ہے جو (۵۲) دفعات پر مشتمل ہے۔[5] اس تاریخی وثیقہ کے بعض فقرات عدل گستری سے بھی

۱۔ ابن ہشام محولہ صدر صفحہ (۸۰۲ - ۸۰۳)۔

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ۔ صفحہ (۲۱)

۳۔ آزاد کے بدلے آزاد غلام کے بدلے غلام عورت کے بدلے عورت ہی قتل کیے جائیں دو کم [illegible]

قرآن مجید ۲: ۱۷۸۔

۴۔ اس مملکت کی حکومت اور نظم و نسق کے لئے دیکھئے امیر علی شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنز صفحہ (۵۵ [illegible]

۵۔ ڈاکٹر حمید اللہ "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" محولہ صدر نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام صفحہ [illegible]

Marfat.com

تعلق رکھتے ہیں چنانچہ فقرہ (۲۴ تا ۱۱) کے لحاظ سے انصار کا ہر قبیلہ اجتماعی طور پر اپنے تمام افراد کے ناجائز افعال کے مکافات کا ذمہ دار تھا۔ فقرہ (۱۳) میں یہ اصول قرار دیا گیا کہ انصاف متفرد کے ہاتھ میں نہ ہوگا بلکہ پوری مسلم جماعت کا فرض سمجھا جائے گا۔ اور اس میں کسی کی رشتہ داری یا قرابت کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ فقرہ (۲۲) میں حکم ہے کہ کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے گا۔ اسی طرح فقرہ (۲۱) میں حکم ہے کہ کسی مسلمان کا قتل عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ البتہ مقتول کے ورثاء فدیہ لے کر قصاص معاف کر سکتے ہیں۔ فقرہ (۱۴) کے لحاظ سے اگر کسی غیر مسلم کے ولی مسلمان ہوں تو انہیں چاہیئے کہ قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں۔

اس وثیقے کا فقرہ (۲۳) یہ ہے کہ ہر قسم کے مناقشات کے لئے آنحضرتؐ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔ یہ چیز نص قرآنی سے بھی ثابت ہے کہ "جب خدا اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن یا مومنہ کو اپنے معاملے کے متعلق کیسے اختیار رہ سکتا ہے"۔[۱] نیز یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ فدیہ۔ دیت۔ ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رکھے گئے (فقرہ ۲۵-۳۱-۴۰) لیکن کوئی یہودی۔ قریش اور ان کے ہمدردوں کو پناہ (جوار) نہیں دے سکتا (ف ۴۳)۔ عدل گستری حقوق عباد کا معاملہ ہے اور کسی شخص کو خود اپنے رشتہ داروں کی طرفداری نہیں کرنی چاہیئے (ف ۳۶ ب - ۳۱) نیز آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ فرمائیں گے۔ (ف ۴۲)

بہرحال اس دستور مملکت میں جو فی الواقع دنیا کے لئے ایک حیرت انگیز دستوری وثیقہ ہے۔ عاملہ اور مقننہ کی ترتیب بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ نظام عدل گستری میں تو ایک انقلاب ہوگیا اور یہ دنیا میں ایک نئے تصور اور نئے پیرائے میں پیش ہوا۔ انفرادی انتقام کی جگہ عدل گستری کا ایک مرکزی ادارہ قائم ہوگیا اور افراد بلکہ قبیلوں سے بھی عدل گستری کا حق چھین لیا گیا اور یہ اختیار حکمران وقت کو ملا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔ انصاف کسی متفرد کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ وہ پوری مسلم جماعت کے فرائض میں داخل ہوگیا۔ یوں تو ہجرت سے پہلے بھی آنحضرت صلعم کی ذات مبارک اپنے پیرؤوں کے لئے سرچشمہ عدالت تھی لیکن مدینہ آتے ہی آپ نے عدالتی حقوق و فرائض کا صاف

---

[۱] قرآن: ۳۳: ۳۶ (سورہ احزاب)

Marfat.com

تعین فرما دیا۔ گویا آپؐ کی ذات انصاف وعدل کا آخری مرجع تھی۔ اور نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی آپؐ کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جانے لگا۔ گو غیر مسلموں کے مقدمات اُن کے شخصی قانون کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ قبیلہ داری افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کی یہ بڑی کامیاب کوشش تھی۔ جس کے لئے ایک شخصیت کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد مرکزی حکومت نے جائدادی محاصل (یعنی زکوٰۃ۔ جزیہ وغیرہ) مسلمانوں سے فوجی خدمت (جہاد) لازم قرار دیئے اور سب مرکزی حکومت کے موضوعہ قوانین کے پابند تھے

یہ نظام عدل گستری جو عہد نبوت میں صورت گیر ہوا تھا، بہت پر مغز اور بڑا سبق آموز ہے۔ قرآن کریم کی کئی آیتوں سے آنحضرت صلعم پر یہ فرض عاید کیا گیا کہ آپؐ لوگوں کے باہمی تنازعات فیصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ۔ اے رسول! لوگوں کے درمیان ان احکام کے بموجب فیصلہ کرو جو اللہ تعالےٰ نے تم پر نازل کئے ہیں۔

اسی طرح مومنوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔

(اے رسول! تمہارے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک مومن کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے باہمی تنازعات میں تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تم جو فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی بار محسوس نہ کریں اور تمہارے ہر حکم اور فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔)"

حضرت پیغمبر اسلام نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ کی رو سے ہر قبیلے میں "نقیب" مقرر فرمائے تھے جو اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتے تھے۔ اور قبیلوں کے اندر نظم قائم رکھتے تھے۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں پر ایک عہدہ دار مقرر تھا جسے "عریف" کہتے تھے اور اس نظام سے بوقت ضرورت عام استصواب میں بھی مدد لی جاتی تھی۔ جب نقیب کے فیصلے سے ناراضی ہوتی تو آنحضرت کے پاس مرافعہ ہوتا تھا۔ مدینے میں آپؐ بہ نفس نفیس تمام عدالتی فرائض انجام دیتے تھے لیکن جب مملکت وسیع ہوتی گئی اور انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرتؐ نے چند مفتی (یعنی قاضی)[1]

---

[1] ابتدا میں قاضی کو مفتی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا (المبسوط للسرخسی ج (۱۶) مطبع السعادۃ بمصر ۱۳۲۴ھ ص ۱۰۹)

خود فرمائے۔ جو فیصلے کیا کرتے تھے۔ البتہ ان کے فیصلوں کے خلاف آنحضرت صلعم کے پاس مرافعہ ہوتا تھا[1]۔ ہر علاقہ کا والی نہ صرف حاکم یعنی عاملانہ عہدہ دار ہوتا تھا بلکہ وہ عدلیہ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا اور حضرت عتاب بن اسید بن ابی العیص بن عبد شمس اموی کو مکہ کا والی مقرر کیا تھا۔ یہ حاکم خود سرکار دو عالم کی زندگی میں مقدمات فیصل کرتے تھے۔ ایسی بھی نظیریں ملتی ہیں کہ وقتی طور پر خاص مقدمات کی سماعت کے لئے قاضی مقرر کئے گئے۔ اور مستقل قاضیوں کی طرح ان کے فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرت کے پاس مرافعے ہوتے تھے[2]۔ غرض خاص مدینے میں ہر قبیلے کے عریف یا نقیب [illegible] اور قاضی ابتدائی عدالت کے فرائض انجام دیتے اور انتہائی عدالت مرافعہ خود جناب رسالت صلعم کی ذات تھی۔ لیکن صوبوں اور قلعوں میں عامل یعنی گورنر ہی سپہ سالاری اور مالی فرائض کے علاوہ قاضی اور محتسب کا کام بھی کرتے تھے اور ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف آنحضرت صلعم کے پاس مرافعے آتے تھے[3]۔ آنحضرت صلعم کے پاس استصواب بھی ہوتا تھا اور آپ عہدہ داروں کے غلط فیصلوں اور غلط کارروائیوں کی صورت میں بصیغہ نگرانی بھی دخل دیتے تھے۔

اب رہا قانون جس کے مطابق عدالت فیصلے صادر کیا کرتی تھی تو وہ قرآن اور حدیث کا مجموعہ تھا۔ کلام ربانی تو آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ احکام جناب رسالت مآب صلعم کے قول اور فعل سے مستنبط ہوئے وہ بھی قرآنی حکم[4] کی بنا پر واجب التعمیل

---

[1] ابن جوزی التراتیب الادارية لکتانی ج ۱ ص [illegible] ڈاکٹر حمید اللہ۔ اسلامی عدالت [illegible] مجلہ عثمانیہ ج ۱۱ شمارہ ۱، ۲، ۴، ۴۳ فصلی [illegible]

[2] مسند ابن حنبل ج ۲ ص [illegible] سیرۃ النبی ج ۱۲ طبع دوم [illegible] مطبع [illegible]۔

[3] ایضاً ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ ۲۶

[4] قرآن مجید ۲۴: ۵۹ ، ۲۱ : ۷ وغیرہ لیکن بعض مستشرقین اسلامی قانون کو بیرونی قوانین اور خصوصاً رومی و بیزنطینی قانون کا خوشہ چین قرار دیتے اور سنت نبوی کو بھی فرضی چیز سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو ڈاکٹر [illegible]۔ لیکن یہ رائے یا تو [illegible] اسلامی اداروں کے متعلق علم کی کمی کا نتیجہ ہے یا پھر تعصب کا اثر۔

Marfat.com

تھے۔ اس راست قانون سازی کے ذریعہ جو احکام مقرر ہو گئے تھے۔ ان کے فقیہ، مجتہد، قاضی سب ہی پابند تھے لیکن اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے ذریعہ اس قانون میں اور لچک پیدا کر دی گئی اور خود حضرت معاذ بن جبل رض کی بڑی نظیر موجود ہے۔ آنحضرت صلعم نے ان کو یمن کا قاضی بنایا تھا اور ان کو جو ہدایتیں دی تھیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی میں کوئی چیز نہ ملے تو اجتہاد کیا جا سکتا ہے[1] اس طرح جب حضرت عمرو بن حزم یمن کے گورنر یا والی بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آنحضرت نے تحریری ہدایت نامہ دیا جو دنیا کے لئے ایک یادگار چیز ہے۔ اس طویل وثیقے میں انہیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ ظلم و ستم سے باز رہیں[2] اس ہدایت نامہ میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ جسمانی مضرتوں کی مختلف صورتوں میں متضرر کو کیا ہرجانہ ملنا چاہیئے[3] جو قاضی مامور ہوتے تھے ان کو یہ بتا دیا جاتا تھا کہ ان کے ایسے فیصلے جو صریح ہدایتوں کے خلاف صادر ہوں وہ سب کالعدم متصور ہوں گے[4]

لیکن انصاف میں قانون کی سخت پابندی کے بجائے استحسان یا نصفت کو بھی جگہ دی گئی تھی[5] اس تصور سے زمانہ جاہلیت کے بہت سے اصول ٹوٹ گئے اور اسلامی دور میں بہت سی نئی چیزیں پیدا کی گئیں۔ مثلاً عمد، مشابہ عمد اور خطا میں فرق کیا گیا[6] اور نیت کا[7] عنصر داخل کیا گیا ہے ایک اور جدت یہ ہوئی کہ معاملات اور جرائم کی ذمہ داری صرف انسانوں پر عاید کی گئی اور دیگر مخلوقات بری سمجھی گئیں ورنہ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی آدمی گڑھے میں

---

۱ عبدالحفیظ صدیقی اسلامی عدل گستری حیدرآباد۔ ۱۹۴۶ء ص ۱۳ بحوالہ ترمذی، ابوداؤد۔

۲ ابن ہشام محولہ صدر صفحہ (۹۶۱-۹۶۲) طبری۔ تاریخ۔ لیڈن۔ ۱۸۷۹-۱۹۰۱ء ص ۱۷۲۷ تا ۱۷۲۹

۳ موطا۔ باب العقول۔ ۴۳: ۱-۱۹

۴ من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فہو رد (مسلم ۳۰: ۱۷ تا ۱۸) من استعملناہ علی عمل فلیأت بقلیلہ وکثیرہ فما اوتی منہ اخذ وما نہی عنہ انتہی (ابوداؤد ۲۳: ۵، صفحہ ۲۷)

۵ قرآن مجید ۱۶: ۹۰ خدا عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

۶ خطبہ حجۃ الوداع۔

۷ انما الاعمال بالنیات۔ حدیث۔ صحاح ستہ۔

Marfat.com

گر کر مر جاتا تو وہ گڑھا اس کا خون بہا قرار دیا جاتا اور وارثوں کی ملک قرار پاتا۔ آنحضرت نے کسی کے پوچھنے پر فرمایا تھا کہ "بے زبان جانور اور کان اور کنویں پہ ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری نہیں[1]" انصاف کے معاملے میں اسلام میں بڑے چھوٹے سب برابر ہیں۔ خود جناب رسالت مآب صلعم نے اپنی ذات کے خلاف مقدمات کی سماعت فرمائی اور مدعیوں کے حق میں فیصلے فرمائے۔ عدالت کے باب میں سعی و سفارش کی قطعی ممانعت فرما دی تھی چنانچہ آپ کے ایک بہت ہی محبوب مولیٰ زادہ اسامہ نے لوگوں کی سفارش کرائی۔ اس وقت آپ کا مشہور تاریخی فقرہ بخاری کی صحیح اور دوسری کتابوں میں اب تک محفوظ ہے کہ محمد کی بیٹی فاطمہ بھی اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ (بخاری وغیرہ) اس اسلامی اصول اور آنحضرت صلعم کے طرز عمل سے اسلامی عدلیہ کی جو اہمیت پیدا ہوئی وہ اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ اس کو افلاطون کے الفاظ میں عدل مطلق کہنا چاہیئے۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ یہ خلفاء اپنے خلاف فیصلہ سننے کے لئے بذات خود قاضی کے روبرو حاضر ہوتے[2] بلکہ یہ پوچھئے تو اموی اور عباسی دور تک بہت سے خود سر بادشاہ بھی پیش ہو کر کھڑے رہتے اور یہی طریق عہد سلجوقیہ اور ہندوستان میں بھی باقی رہا[3]۔ جناب رسالت مآب صلعم کا عدل مطلق آپ کے آخری خطبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ اگر مجھ پر کوئی ذمہ داری ہے تو اس کی تلافی کے لئے میں حاضر ہوں۔ اس پر ایک شخص نے چند درہم قرض کا مطالبہ کیا جس کی ادائیگی کر دی گئی[4]

آنحضرت نے عدل گستری کا یہ بنیادی اصول قرار دیا کہ بغیر ثبوت کے کسی دعویٰ کو نہیں مانا جا سکتا[5]۔ چنانچہ حدیث میں امور متعلقہ طلب اور پیش شدہ شہادت کے متعلق بہت سے احکام ملتے ہیں۔ مثلاً قاضی کا فرض ہے کہ وہ روئداد پر فیصلہ کرے اور اپنی

---

1. ابو یوسف۔ کتاب الخراج بولاق ۱۳۰۲ھ ص ۱۳
2. سرخسی مبسوط ج (۱۶) صفحہ ۶۳، ۶۷، ۱۲۲
3. محمد اللہ صفحہ (۱۶)
4. مولانا شبلی۔ سیرۃ النبی جلد ۲ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع دوم ۱۳۴۳ھ صفحہ (۹۹ تا ۲۰۲)
5. مسند احمد بن حنبل ج (۱) طبع میمنیہ ۱۳۱۳ھ صفحہ (۲۴۳، ۲۴۴، ۲۶۳)۔

مخصومات کو داخل نہ کرے۔ دونوں فریق کا بیان سننے کے بعد فیصلہ کیا جائے[1] ابن الزبیرؓ سے روایت ہے کہ حاکم عدالت کے سامنے فریقین مقدمہ کا حاضر رہنا اور دونوں کی شہادت پیش ہونا ضروری ہے۔ آنحضرت فرماتے ہیں کہ وہ خود شہادت اور روداد پر فیصلہ فرماتے ہیں۔ نیز آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اور انسانوں کی طرح آپ سے بھی غلطی کا امکان ہے۔ کیونکہ جب لوگ فیصلہ کے لئے آتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی فریق اپنا معاملہ اچھے پیرائے اور بہتر انداز میں پیش کرے اور اسی کے حق میں فیصلہ کیا جائے۔ اس طرح آنحضرت صلعم نے عدالت کا یہ اہم ضابطہ مقرر فرمایا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے اور مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے تو مدعی علیہ کو قسم دی جائے[2] اگر مدعی علیہ کے پاس جوابی ثبوت نہ ہو تو مدعی حلف کے ذریعہ اپنے ناقص ثبوت کی تلافی کرے۔ اور ہر حال میں دو گواہ ضروری قرار دیئے جائیں۔ لیکن ایک سے زیادہ گواہ پیش نہ ہو سکے تو حلف پر فیصلہ کیا جائے[3]

ان مقدمات میں جہاں ماہرین کی رائے ضروری ہوتی۔ مثلاً تعمیرات، زراعت وغیرہ کے مقدمات میں آنحضرت ماہرین کی رائے پر فیصلہ فرماتے تھے[4] فوجداری مقدموں میں ختم تحقیقات تک ملزم کو اور قرضوں کی ادائی تک مدیون کو حوالات میں رکھا جاتا تھا نیز ضامن کا مچلکہ بھی لیا جاتا تھا[5]

---

[1] حضرت علی کو ہدایت بحوالہ کنز العمال اور ابن حنبل اور احادیث صحیحہ حاجی محمد بن عبداللہ المنجم الثاقب فی اتفقیۃ علی بن ابی طالب (حیدرآباد دکن ۱۳۶۱ھ) ص ۱۱۵ - ۱۱۷)
"جب تم مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان فیصلہ کرنے بیٹھو تو سب سے پہلے دونوں کا بیان سن لو۔ جب تم دونوں کا بیان سن لوگے تو تم پر مقدمہ کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی اور فصل خصومات میں بڑی آسانی ہو جائے گی"

[2] ترمذی ۱۳: ۵ ابوداؤد ۲۳: ۲۲ (الف) مرزا ابو الفضل حدیث ۳۷۵ (ب) مسلم ۳۰: ۴ ترمذی ۱۳: ۱۱ البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ (والیمین علی من انکر) بخاری و مسلم

[3] ابن ماجہ ۱۳: ۳۶۸۔ نسائی ۴۹: ۳۱ ترمذی ۱۳: ۱۲

[4] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۵۷۳)۔ (بحوالہ کتانی۔ کتاب الاموال وغیرہ)۔

[5] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۳۴)۔ (بحوالہ ابو داؤد۔ قرطبی۔ کتانی)۔

اسلامی قانون اور عدل گستری کے لئے دو قسم کی تہدیدیں تھیں۔ ایک تو حکومت کی طاقت تھی اور دوسری احکام خداوندی کی عظمت۔ یعنی تمام اسلامی قوانین احکام خداوندی ہیں اور ہر فرد پر لازم ہے کہ ظاہر و باطن دونوں طرح احکام خداوندی کی پابندی کرے اور گناہ سے بچے اور یوم حشر و حساب سے ڈرے۔

(۳) جبل الرحمۃ کا خطبہ[1]۔

جناب رسالت مآب صلعم نے سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر جبل الرحمۃ سے جو یادگار تاریخی تقریر فرمائی وہ یوں تو عالم اسلام کے لئے ایک عظیم الشان منشور اساسی ہے۔ لیکن یہ تقریر اسلامی عدل گستری کے لئے بھی ایک بڑا پیمانہ اور اعلان حقوق انسانی ہے۔ جناب رسالت مآب صلعم نے اس خطبے میں فرمایا کہ انسان کے تین بنیادی حقوق ہیں۔ یعنی جان مال اور آبرو[2] اور یہ قابل احترام ہیں۔ امانت اور قرض واپس کیئے جائیں۔ زمانہ جاہلیت کا سود موضوع ہے۔ اور سب سے پہلے میں حضرت عباس کے سود کالعدم قرار دیتا ہوں ... زمانہ جاہلیت میں جو خون ہوئے وہ اب فراموش کر دیئے جائیں اور لوگ انتقام کا خیال نہ کریں۔ خود میں اپنے چچا زاد بھتیجے کا خون معاف کرتا ہوں ... قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا۔ اور قتل شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا ... میاں بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں ... سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بلا رضامندی کوئی کسی کا مال نہ لے اور نہ آپس میں جنگ و جدل ہو ... سب لوگوں کا ایک خدا ہے اور سب انسانوں کا باپ بھی ایک ہے تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی اور دیندار ہو۔ اور نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ... وراثت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن ہشام حوالہ صدر صفحہ (۹۶۶ تا ۹۷۰) تاریخ طبری لیدن ۱۸۷۹-۱۹۰۱ء (سیریز ۱، ۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵) تاریخ یعقوبی لیدن صفحہ (۱۲۲-۱۲۳) البیان والتبیین ابوعثمان الجاحظ جلد ۲ صفحہ (۲۴-۲۶) ابن الاثیر جلد ۲ صفحہ (۱۲۰) سیرۃ محمدیہ از محمد کرامت علی دہلوی الموسوی نوشتہ و مطبوعہ حیدرآباد دکن۔ باب حجۃ الوداع۔ امیر علی: اسپرٹ آف اسلام (۱۹۳۵ لندن، صفحہ (۱۱۴) مختارات الادب مرتبہ زیدان المصری (۱۹۳۷ء، مطبع مصر۔ صفحہ (۴۶-۴۸) ۔

[2] :- جان مال اور آبرو میں فوجداری۔ دیوانی اور ثالث آجاتے ہیں۔

کے حصے خدا نے مقرر فرما دیئے ہیں۔ وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی نہیں ہو سکتی۔ بچہ عورت کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے ... نسب اور ولاء میں جھوٹے دعوے اور جھوٹی کوششیں ملعون افعال ہیں ... وغیرہ۔

یہ دراصل اعلان حقوق انسانی ہے۔ عدل اور عدل گستری سے متعلق خطبہ حجۃ الوداع کی مثال دنیا کے کسی تمدن میں موجود نہیں ہے۔ یہ بھی اسلامی عدل گستری کا بڑا ماخذ ہے۔

عہد نبوی صلعم کے بعض صیغہ جات :-

قضاء | آنحضرت کے عہد میں عہدۂ قضاء قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبل کو حضورؐ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔ لیکن مدینہ اور اس کے مضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ فرماتے تھے۔ احادیث کی کتابوں میں آپ کے بے شمار فیصلے ملتے ہیں۔ احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں۔

احتساب | آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں محکمہ احتساب قائم نہیں ہوا تھا بلکہ حضورؐ خود ہی اس فرض کو ادا فرماتے تھے۔ لوگوں کے جزئیات، اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ دارو گیر فرمایا کرتے تھے تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے۔ جو لوگ باز نہیں آتے تھے۔ ان کو سزائیں بھی دیتے تھے۔ بخاری کتاب البیوع میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔

کبھی آپ خود بازار تشریف لے جاتے اور حالات کی تحقیق فرماتے۔ ایک دفعہ بازار میں غلہ کا انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے فرمایا یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ بارش سے بھیگا ہوا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے۔ جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[1]

فرائض احتساب میں عمال کا محاسبہ بھی فرماتے تھے۔ جب وہ صدقہ اور زکوٰۃ وصول کر کے آتے تو آپ ان کا جائزہ لیتے کہ انہوں نے ناجائز طریقہ تو استعمال نہیں کیا۔ ایک بار ایک صاحب کو

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان بحوالہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ج (۲) طبع دوم ۱۴۱۲ھ ص ۶۲، ۶۳

Marfat.com

صدقہ کی وصولی کے لئے مامور فرمایا وہ کام سے واپس ہوئے تو انہوں نے کہا کہ فلاں مال مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "گھر بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا" اس کے بعد ایک خطبہ دیا۔ جس میں آپ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی[1]

آنحضرتؐ کے بعد اسلامی دور ترقی میں محکمہ احتساب ایک مستقل محکمہ بن گیا۔ جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شراء اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا۔

مصالحت | جہاں نزاع ہوتی تھی وہاں فریقین میں مفاہمت کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی تو آپ چند صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے[2]

ایک دفعہ اہل قبا کے درمیان نزاع ہوئی اور لوگوں نے ایک دوسرے پر پتھر پھینکے۔ خبر ملی تو حضور صلعم صحابہ کے ساتھ کافی دور پیدل تشریف لے گئے[3]

جمع صدقات | قاضی کے فرائض میں صدقات جمع کرنے کا کام بھی شامل تھا۔ چنانچہ معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک حصہ یعنی جند کا قاضی بنایا گیا تھا۔ اور ان کو ہدایت تھی کہ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں اور چونکہ عمال یمن میں تھے ان کے صدقات جمع کرنے کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی[4]

پولیس | آنحضرتؐ کے عہد میں اس کی ابتدائی شکل پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ قیس بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے[5] باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قائم نہیں ہوا تھا اور اس کی ابتدا بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی[6]

جلاد | مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن ثابت، ضحاک بن سفیان کلابی کے سپرد تھی[7]

---

1. بخاری ج (۲) کتاب الاحکام کے بحوالہ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی ج ص ۶۳
2. بخاری ج (۱) کتاب الصلح بحوالہ شبلی! سیرۃ النبی ج (۲) طبع دوم۔ ۱۴۱۳ھ ص ۶۴
3. ~~~~~~
4. مسند ابن حنبل ج (۵)، بحوالہ شبلی: سیرۃ النبی ص ۶۸
5. بخاری کتاب الاحکام
6. فتح الباری ج (۱۳)، بحوالہ شبلی: سیرۃ النبی ج (۲) محولہ صدر ص ۶۷
7. زاد المعاد ابن قیم بحوالہ شبلی سیرۃ النبی ج ص ۶۷

Marfat.com

عہد نبوی کی بعض نظیریں:-

عبداللہ بن سہیل کو خیبر کے یہودیوں نے شہید کر دیا۔ مقتول کے وارث مہیسہ نے آنحضرتؐ کے پاس مقدمہ دائر کیا۔ لیکن اس واقعہ کی کوئی عینی شہادت پیش نہ کر سکے۔ آنحضرتؐ نے بیت المال سے ایک سو اونٹ خوں بہا میں دلوا دیئے۔[1]

جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرتؐ کے سامنے اپنی دو لڑکیوں کو لے آئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ دونوں ثابت بن قیس کی لڑکیاں ہیں جو احد میں شہید ہوئے۔ ان کے چچا نے ان کی ساری جائداد غصب کر لی اور ان لڑکیوں کو کچھ نہیں دیا۔ بغیر جائداد کے ان لڑکیوں کی شادی بھی نہیں ہو سکتی۔ یا رسول اللہ آپ انصاف فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدا ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد سورۂ نساء نازل ہوئی اور آنحضرتؐ نے اس عورت اور لڑکیوں کے چچا کو بلا کر فرمایا کہ موخر الذکر دو تہائی جائداد دونوں لڑکیوں کو دے دے اور اٹھواں حصہ (۱/۸) اس عورت کو۔ اور اس تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ خود لے لے۔[2]

آنحضرتؐ کے پاس ایک شخص کسی آدمی کو پکڑ لایا اور عرض کیا کہ اس آدمی نے میرے بھائی کو قتل کر دیا۔ آپ نے فرمایا "جاؤ اس کو بھی اسی طرح مار ڈالو جس طرح اس نے تمہارے بھائی کو مارا ہے"۔ قاتل نے اس شخص سے کہا "خدا سے ڈرو اور مجھے معاف کر دو کیونکہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ مجھ کو چھوڑ دو اور تمہارے لئے اور تمہارے بھائی کے لئے بھی بہتر یہ ہے کہ معاملہ یوم حشر پر چھوڑ دے"۔ اس پر اس شخص نے قاتل کو چھوڑ دیا۔ بعد میں جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ قاتل نے کیا کہا تھا تو ارشاد فرمایا "قصاص کے بدلے یہی بہتر تھا کہ مقتول آدمی حشر کے دن قاتل کے سامنے خدا سے فریاد کرے کہ یا اللہ! اس شخص سے پوچھا جائے کہ اس نے میری جان کیوں لی"۔[3]

ایک شخص آنحضرتؐ کے سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ فریاد کی کہ یا رسول اللہ! اس شخص نے میرے بھائی کی جان لی۔ رسول اکرمؐ نے پوچھا "کیا تم نے اسے مارا؟" اس شخص نے کہا کہ اگر یہ جرم کا اقبال نہ کرے تو میں شہادت لاؤں گا۔ ملزم نے کہا "ہاں میں نے اسے مارا ہے"۔

---

[1] بخاری و نسائی بحوالہ محمد اللہ۔

[2] " " " "

[3] ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ بحوالہ مرزا ابو الفضل محولہ صدر ص ۱۹۱ حدیث ۸۱۹

Marfat.com

آنحضرتؐ نے سوال فرمایا "کس طرح؟" اس نے کہا "مقتول اور میں دونوں ایک جھاڑ کے پتے توڑ رہے تھے۔ مقتول نے مجھے گالیاں دیں اور بہت مشتعل کردیا۔ میں نے اپنی کلہاڑی اس کے سر پہ ماری اور وہ مر گیا۔ لیکن میرا مقصد اس کی جان لینا نہ تھا۔" آنحضرتؐ نے پوچھا "کیا تمہارے پاس کچھ سرمایہ ہے جس سے خون بہا ادا کرسکو؟" اس نے جواب دیا کہ میرے پاس جسم کے کپڑے اور کلہاڑی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا "کیا تمہارا کوئی دوست ایسا ہے جو تم کو کچھ دے سکے؟" اس نے کہا "میں اپنے لوگوں میں سب سے زیادہ بے حیثیت ہوں اور کوئی مجھے نہیں دے سکتا۔" آنحضرتؐ نے ایک کپڑا اس کی طرف پھینک دیا اور مستغیث سے فرمایا "اپنے ساتھی کو گرفتار کرلو۔" جب وہ جانے لگے تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "اگر یہ شخص اسے مار ڈالے تو یہ بھی اسی کے جیسا ہوگا۔" اس پر اس شخص نے پلٹ کر کہا "آپ نے جو فرمایا وہ میں نے سن لیا لیکن آپ ہی کی اجازت سے تو میں نے اسے گرفتار کیا ہے۔" آنحضرتؐ نے سوال کیا "کیا تمہاری یہ خواہش نہیں کہ اس کا گناہ اسی کی گردن پہ رہے اور تمہارے بھائی کا گناہ بھی اسی کی گردن پہ رہے؟" اس نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہ۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "تحقیق کہ یہ ایسی ہی بات ہے۔" اس پر اس شخص نے قاتل کو چھوڑ دیا۔[۱]

ہلال بن امیہ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور رپورٹ کی کہ ان کی بیوی نے شارک سحیمہ کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے قرآنی اصول[۲] کے مطابق چار گواہ طلب فرمائے اور فرمایا کہ اگر وہ شہادت نہ دے سکے تو لعان کی سزا یعنی ۸۰ اسی درے ان کے لگائے جائیں گے۔ اس پر ہلال نے کہا "میں حلفاً کہتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں خدا اپنا حکم بھیج کر مجھے کوڑوں سے بچائے گا۔" اسی کے بعد یہ آیتِ قرآنی نازل ہوئی کہ جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں لیکن شہادت پیش نہیں کرسکتے اور صرف اپنے کو شہادت میں پیش کرسکتے ہیں تو ان کے لئے بھی یہی شہادت ہے کہ وہ چار دفعہ خدا کی قسم کھا کر بیان کریں کہ وہ سچ بولتے ہیں اور پانچویں مرتبہ کہیں کہ اگر وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں تو خدا کی ان پر لعنت ہو۔[۳] لیکن عورت چار بار خدا

---

[۱] مسلم، ابوداؤد اور نسائی بحوالہ مرزا ابوالفضل مجلہ صدرہ ۱۹۲-۱۹۳ حدیث ۸۲۱

[۲] قرآن مجید ۲۴: ۴-۲۴: ۵۔

[۳] قرآن مجید ۲۴: ۶-۷۔

Marfat.com

کی قسم کھا کر کہے کہ اگر وہ جھوٹ بولتی ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو تو عورت پر سے سزا اٹھ جائے گی۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ نے ہلال کو حلف لینے کی اجازت دی۔ عورت نے بھی حلف کیا۔ اس عورت کے بعد میں ایک بچہ بھی ہوا جو شارک کے مشابہ تھا۔ لیکن اسے سزا نہیں دی گئی۔ کیونکہ لعان کا ضابطہ اس کے مانع تھا۔[1]

دو آدمی آپ کے پاس اپنے مقدمہ کے فیصلے کے لئے آئے۔ وراثت کا معاملہ تھا۔ آپ نے ان کا حال سننے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ "تم دونوں رسول اللہ کے پاس اپنے جھگڑے کے تصفیے کے لئے آئے ہو۔ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص چرب زبانی سے ایسی دلیلیں پیش کر دے جو دوسرا پیش نہ کر سکتا ہو اور میں ان ہی دلیلوں کے مطابق فیصلہ کر دوں گا۔ جو میرے سامنے پیش کی جائیں گی۔ لیکن یاد رکھو کہ جو شخص میرے فیصلے کے باوجود اپنے بھائی کی جائداد کا کچھ حصہ ناجائز طور پر حاصل کرنے تو دراصل وہ اپنے لئے آگ کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔ قیامت کے دن وہ آگ اس کے گلے میں ہو گی اور وہ خود اسے زیادہ جھڑکائے گا۔" یہ سن کر دونوں شخص رو پڑے اور ہر ایک نے کہا میں اپنا حق اپنے بھائی کو دیتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "جاؤ اور جائداد کو حق اور انصاف اور احکام شریعت کے مطابق آپس میں تقسیم کر لو۔"[2]

(۴) عدل گستری خلافت راشدہ میں :-

آنحضرت صلعم کے بعد اسلامی مملکت کے جو صدر بنے وہ خلیفہ کہلاتے ہیں۔ خلفاء راشدین کا عہد بھی اسلامی عدل گستری کا ایک بڑا ماخذ ہے کیونکہ جو نظام سیاسی و عدل گستری پیغمبر اسلام صلعم کے مبارک ہاتھوں قایم ہوا تھا وہ نہ صرف پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار رہا بلکہ سچ پوچھئے تو اس میں بہت سے ضروری اضافے بھی ہوئے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں مملکت کا پورا نظم و نسق قرآن اور سنت نبوی کا آئینہ تھا اور قرآن و حدیث ہی مملکت کا دستور تھا۔ البتہ اجماع کے اصول سے ضرور فائدہ اٹھایا

---

[1] بخاری بحوالہ محمد اللہ محولہ صدر ص ۱۴ تا ۱۵

[2] مسند احمد بن حنبل بحوالہ عرفوس: تاریخ القضاء فی الاسلام (اردو ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی۔ لاہور ۱۹۶۰ء) ص ۳۵

جاتا تھا۔ خود خلیفہ اول کا انتخاب بھی اسی اصول اجماع کے مطابق ہوا۔ عدل گستری میں بھی ان خلفاء نے قرآن اور سنت کی پوری اتباع کی اور جس مسئلہ میں کوئی نظیر نہ ملتی، تو اجماع کے ذریعہ فیصلہ ہوتا۔ حضرت ابوبکر بھی بعض مسایل میں خود اجتہاد کرتے تھے اور بقول شاہ ولی اللہؒ وہ "شیخ و استاد جمیع مجتہدین" ہیں[1] خلیفہ دوم نے حضرت ابوبکر کے تمام اضافے تسلیم کرلئے اور خود بھی کئی نظیریں قایم کردیں۔ خلیفہ سوم و چہارم کے زمانے میں بھی قرآن سنت۔ نظائر اور پھر اجماع اور اجتہاد سے کام لیا گیا۔ عدل گستری کے لئے قاضی مقرر تھے، جن کو خلیفہ مامور کرتے تھے قاضی عامل سے آزاد رکھے گئے تھے[2]

آنحضرتؐ کے بعد حضرت صدیق اسلامی مملکت کے صدر منتخب ہوئے، جن کو خلیفہ کہا جاتا تھا۔ آپ کے ذاتی اوصاف دربار رسالتؐ کی قربت کی بدولت خوب نکھر گئے تھے۔ اور آپ کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ تمام اکابر صحابہ ہر مشکل مسئلہ میں آپ ہی سے رجوع کرتے تھے۔ قرآن شریف کی جمع اور ترتیب آپ ہی کا کام تھا۔ جس کو زید بن ثابتؓ نے انجام دیا آپ حدیث کے بھی بڑے ماہر تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ ہی کے سوالات کے جواب میں متعدد حدیثیں ارشاد ہوئی تھیں[3] فقہ کے متعلق اجتہاد کا قاعدہ مقرر کیا جو سارے مجتہدوں کا دستور العمل بن گیا[4]

آنحضرتؐ کے انتقال پر سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین نے خلافت کے لئے حضرت صدیقؓ کا انتخاب کیا اور بہ اتفاق آراء ان کے ہاتھ پر بیعت کی جو بیعت خاصہ کہلاتی ہے اس کے دوسرے روز مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں نے بیعت کی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے خطبۂ خلافت دیا۔ یہ خطبہ یوں تو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک یادگار چیز ہے۔ لیکن اس کے بعض اجزاء حضرت خلیفہ اولؓ کے احساس ذمہ داری اور تصور عدل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "مجھ کو حکومت میں کچھ راحت نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسے امر عظیم کی تکلیف دی گئی ہے۔ جس کے برداشت کی مجھ میں طاقت نہیں۔ اور نہ وہ اللہ عزوجل کی مدد کے بغیر

---

[1] ازالۃ الخفا بحوالہ محمد اللہ صہ ۱۸۔ [2] امیر علی۔ شارٹ ہسٹری ص ۶۲۔

[3] حبیب الرحمن خاں شیروانی۔ سیرۃ الصدیق محولہ صدر صہ ۱۲۲

[4] محمد اللہ۔ اڈمنسٹریشن آف جسٹس آف مسلم لا۔ الہ آباد۔ ۱۹۲۶۔ صہ ۱۸

Marfat.com

قابو میں آسکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہارا امیر بنایا گیا اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں راہ راست پر چلوں تو میری مدد کرو۔ اگر بے راہ چلوں تو سیدھا کر دو۔ تم میں جو کمزور ہے۔ وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ انشاء اللہ اس کا حق دلاؤں گا۔ اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے۔ اس سے انشاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرو۔ اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں، تم کو میری اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔[۱]

حضرت صدیق اکبرؓ کی حکومت قرآن و حدیث پر مبنی تھی۔ جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تھا تو سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے پھر حدیث سے مدد لیتے تھے۔ ان کو خود حدیث معلوم نہ ہوتی تو صحابہ کے مجمع میں آکر دریافت کرتے کہ فلاں معاملہ میں کسی کو کوئی حدیث یاد ہے جب حدیث بھی نہ ملتی تو صحابہ کرام میں جو اہل الرائے اور بزرگ تھے، ان کو جمع کرکے مشورہ کرتے۔ جس رائے پر اجماع ہو جاتا اسی پر کاربند ہوتے۔[۲] عہد نبوی کی طرح ان کے زمانے میں بھی یہ طریقہ جاری رہا کہ مدینہ میں خلیفہ فصل خصومات کرتے اور دوسرے علاقوں میں عامل عدلیاتی فرائض بھی انجام دیتے۔[۳]

حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کو جو ان کے مشیر خاص بھی تھے، قاضی مقرر کیا تھا۔ اور اگر مصنف سیرۃ الصدیق کا دعویٰ صحیح مانا جائے تو اس زمانے میں لوگ اپنے حقوق سے اتنے مطمئن تھے اور سب اتنے ایماندار تھے کہ حضرت عمرؓ کے عدالتی اجلاس میں ایک مقدمہ بھی پیش نہیں ہوا۔[۴]

حضرت صدیق اکبرؓ کے سامنے جو مقدمات آئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعض اہم قانونی مسائل طے فرمائے اور بہت سے مسئلوں کی وضاحت بھی کی۔ چنانچہ ایک دلچسپ نظیر حق حضانت کے سلسلے میں ملتی ہے۔ جس میں خود حضرت عمرؓ فریق تھے۔ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ "اے عمر! اس بچے کے لیئے اس کی ماں کا تھوک تمہارے دیئے ہوئے شہد سے بہتر

---

[۱] سیرۃ الصدیق بحوالہ صدر ص ۵۹ تا ۶۰
[۲] عبد الحفیظ صدیقی۔ اسلامی عدل گستری نیز ملاحظہ ہو عروس بحوالہ صدر ص ۵۱، ۵۲، ۱۹۴۸ ص ۴۹-۵۰
[۳] عروس ص ۴۴ بحوالہ صدر۔
[۴] سیرۃ الصدیق ص ۱۱۹ ۔ نیز ملاحظہ ہو محمد شاہ خان: حیات صدیق اکبرؓ ص ۳۰۷ ۔

ہے[1]۔ اسی طرح ایک اور مقدمہ میں حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک حدیث کی وضاحت فرمائی ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور مقدمہ پیش کیا کہ "میرا باپ میری جائداد لینا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اسے پوری جائداد کی ضرورت ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کے باپ سے فرمایا کہ تمہارا اس کی جائداد پر صرف اس قدر حق ہے جو تمہاری زیست کے لئے کافی ہے"۔ باپ نے عرض کیا "اے نائب رسول خدا! کیا رسول خدا نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ تم اور تمہاری چیزیں تمہارے باپ کی ہیں؟" خلیفہ نے جواب دیا "ہاں آپ کا منشاء صرف ضروری[2] چیزوں سے تھا۔[3]

حضرت صدیق اکبرؓ نے قانون وراثت میں بھی ایک اہم نظر قائم فرمائی۔ آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دادا حقیقی بہنوں اور بھائیوں کو وراثت سے محروم کردے گا۔ خلیفہ اوّلؓ کے اس خیال سے امام ابوحنیفہ بھی متفق ہیں اور اہل سنت کے حنفی فرقے میں یہی اصول اب تک قائم رہا ہے۔ جو حضرات اس خیال کے مخالف ہیں یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ دادا کی موجودگی سے بھائی بہن محروم نہ ہوں گے، ان میں (۱) ابو یوسف (۲) امام محمد (۳) امام مالک (۴) امام شافعی (۵) حضرت علیؓ (۶) امام زیدؓ شامل ہیں۔[4]

عدل گستری عہد فاروقی میں:- حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے آپ کا عہد تاریخ اسلام کا ایک زریں باب ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اسلامی سلطنت کے حدود بہت وسیع ہوگئے اور اسلامی سلطنت کا نظم و نسق اور عدل گستری کا انتظام بہت بلند معیار پر پہنچ گیا۔ نظام حکومت اتنا باضابطہ قائم ہوا کہ آپ کی وفات تک حکومت کے مختلف شعبے وجود میں آچکے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک جمہوری حکومت کا نقشہ مرتب کیا اور ایک ایسے طرز حکومت کی بنا ڈالی جو اسلام کی حقیقی روح تھا۔ مجلس شوریٰ یعنی کونسل میں بحث طلب امور خلیفہ پیش کرتے تھے۔[5] اس مجلس میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، معاذ بن جبلؓ

---

[1] محمد اللہ محولہ صدر ص ۱۹۰۱۸ (بحوالہ شرح مجمع البحرین۔

[2] NECESSARY MAINTENANCE یعنی نفقہ پدری

[3] علامہ جلال الدین سیوطی۔ تاریخ الخلفا۔ اردو ترجمہ از خلیل الرحمٰن میرٹھی۔ مطبع صدیقی لاہور ۱۳۲۴ھ ص ۴۶

[4] محمد اللہ محولہ صدر ص ۱۹

[5] تاریخ طبری لیڈن ۱۸۷۹-۱۹۰۱ء ص ۲۵۷۴

ابی بن کعبؓ زید بن ثابتؓ وغیرہ جیسی شخصیتیں شامل تھیں[1] ملکی نظم و نسق کے مسائل اس مجلس میں پیش ہوتے تھے اور بغیر مشورے اور کثرت رائے کے کوئی امر طے نہیں پاتا تھا[2] روزمرہ کاروبار میں مجلس شوریٰ کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اہم معاملات میں مہاجرین و انصار کا عام اجلاس ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے مسائل طے پاتے تھے[3] حضرت فاروقؓ نے کئی دفعہ فرمایا کہ مشورے کے بغیر خلافت ہی جائز نہیں[4]

مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عام لوگوں کو بھی انتظامی امور میں حصہ لینے کا حق تھا۔ صوبوں اور ضلعوں کے حاکم عموماً مقامی باشندوں کے انتخاب پر بالکل اسی طرح مقرر ہوتے تھے جس طرح آج ممالک متحدہ کے صوبائی گورنر منتخب کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد بصرے سے حجاج بن علاط، شام سے معن بن یزید منتخب ہو کر آئے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان ہی کو حاکم مقرر کیا[5] جب کسی حاکم سے مقامی آبادی ناراض ہوتی تو اس کو معزول بھی کیا جاتا تھا چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو کوفے کے والی تھے رعایا کی شکایت پر معزول کئے گئے[6]

مملکتی نظم و نسق کو مختلف شعبوں میں باضابطہ طور پر تقسیم کیا گیا تھا اور اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا تھا کہ عاملہ کو عدلیہ سے الگ رکھا جائے۔ سب سے پہلے حضرت فاروقؓ نے اسلامی مملکت کی مختلف صوبوں میں باضابطہ تقسیم کی۔ پڑے پیٹے اور تناسب کے ساتھ حدود قائم کئے[7] بعض مفتوحہ علاقوں میں تو وہاں کا پچھلا نظام مناسب ترمیموں کے ساتھ بحال رکھا۔ چنانچہ فارس وغیرہ میں نوشیروانی انتظامات بحال رکھے گئے تھے[8] لیکن دیگر صوبوں میں اپنا نظم و نسق پوری شان کے ساتھ قائم کر دیا۔ چنانچہ ہر صوبے میں حاکم صوبہ یا والی، کاتب یعنی میر منشی، کاتب دیوان یعنی

---

[1] کنز العمال بحوالہ طبقات ابن سعد جلد ۴ صہ ۱۳۴ (مطبوعہ حیدر آباد)

[2] مجلس کے طریقہ کار نیز فاروقی نظم و نسق کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عبد الحفیظ صدیقی اسلامی عوامی[illegible]

[3] مولانا شبلی الفاروق۔ سجاد پبلشرز لاہور۔ ۱۹۶۰ صہ ۲۵۴۔

[4] لاخلافۃ الاعن مشورۃ۔ الفاروق بحوالہ عدد رصہ ۲۵۶

[5] ابو یوسف: کتاب الخراج۔ بولاق۔ ۱۳۰۲ھ صہ ۶۴

[6] الفاروق صہ ۲۵۷

[7] الفاروق صہ ۲۶۴

دفتر فوج کا میر منشی، صاحب الخراج یعنی تعلقدار، صاحب احداث یعنی پولیس کا عہدہ دار، صاحب بیت المال یعنی افسر خزانہ اور قاضی وغیرہ مقرر تھے۔ مثال کے طور پر کوفے کے والی عمار بن یاسر تھے۔ صاحب الخراج عثمان بن حنیف تھے۔ صاحب بیت المال عبداللہ بن مسعود تھے۔ شریح قاضی تھے۔ عبداللہ بن الخزاعی کاتب دیوان تھے[1] صوبہ کی طرح ہر ضلع میں بھی اسی طرح عہدہ دار مقرر تھے جو گورنر کے ماتحت تھے۔ پرگنوں میں صرف تحصیلدار اور اس کے عملہ ہوتا تھا[2]

عہدہ داروں کے تقرر کے وقت ان کو ایک فرمان دیا جاتا تھا جس میں ان کے اختیارات اور فرائض کا تعین ہوتا تھا[3] نیز عہدہ دار کے مال و اسباب کی تفصیلی فہرست بھی تیار کی جاتی تھی اگر کوئی عہدہ دار اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرتا یا اس کے مال و اسباب میں اضافہ ہوتا تھا تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا[4] حج کے زمانے میں تمام عامل طلب کئے جاتے تھے اور دار و عام اعلان فرماتے تھے کہ کسی کو کوئی شکایت ہو تو پیش کرے[5]

ایک دفعہ تمام عامل جمع تھے۔ ایک شخص نے اٹھ کر شکایت کی کہ آپ کے عامل نے مجھے بے وجہ سو کوڑے مارے۔ خلیفہ نے مستغیث کو حکم دیا کہ مجمع عام میں ان کو سو کوڑے لگائے۔ عمرو بن العاص نے عرض کیا کہ یہ بات تمام عاملوں پر گراں گزرے گی۔ خلیفہ نے فرمایا کہ میں انتقام سے باز نہیں رہ سکتا۔ عمرو بن العاص نے منت کر کے مستغیث کو اس شرط پر راضی کر لیا کہ وہ دو سو اشرفیاں [illegible] لے کر اپنے حق سے باز آئے[6]

صیغۂ عدالت | حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے عدل گستری کے لئے بھی عہدہ [illegible] اور سنت کی پوری پیروی کی۔ نیز خلیفہ اول کے زمانے کے انتظامات بھی قبول کئے اور [illegible] بہت سی نظیریں قائم کیں۔

---

[1] طبری بحوالہ صدر ص ۲۷۴۳ - ابن خلکان وفیات الاعیان - قاہرہ - ۱۹۴۸ء ص ۲۵۲ -

[2] الفاروق بحوالہ صدر ص ۲۶۴ -

[3] طبری بحوالہ صدر ص ۱۴۷ -

[4] بلاذری فتوح البلدان ص ۲۱۹ کے حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ ص ۵۶ -

[5] طبری بحوالہ صدر ص ۲۶۸

[6] ابو یوسف کتاب الخراج بولاق ۱۳۰۲ھ ص ۶۶ -

Marfat.com

عہد فاروقی میں عدالت کا ایک جداگانہ صیغہ بن گیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد تک عدلیہ کے فرائض ایسے ہی اشخاص انجام دیتے تھے جن کو عاملانہ اختیار بھی حاصل تھا اور یہی طریقہ کار ابتدائی عہد فاروقی میں بھی رائج تھا کہ جو شخص با اثر اور صاحب عظمت نہ ہو قاضی مقرر نہ کیا جاتا[1] لیکن جب مملکتی نظم و نسق مستحکم ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے قضاء کا صیغہ بالکل الگ کر دیا اور اس طرح عاملہ کو عدلیہ سے خارج کر دیا۔

مملکت کی صوبہ وار ی تقسیم کے بعد ہر ضلع میں عدالتیں قائم کی گئیں اور قاضی مقرر کئے گئے حضرت عمرؓ نے کہا تھا: اگر کوئی حاکم، عامل اور قاضی کے تقرر کے وقت اقربا پروری، دوست نوازی اور جانب داری سے کام لے تو عامل یا قاضی کے غلط فیصلوں کی وجہ سے حاکم اور قاضی کے سر جو گناہ ہوگا اس میں وہ امیر بھی برابر کا شریک ہوگا جس نے اس کا تقرر کیا تھا[2] اسی طرح کسی شخص کو امارت یا قضاء کا عہدہ سپرد کرتے وقت اگر امیر کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی بھلائی ہو تو صحیح فیصلوں کی وجہ سے حاکم اور قاضی کو جو اجر ملے گا اس میں امیر بھی برابر کا شریک ہوگا۔ اگر حاکم یا قاضی بد دیانتی سے کوئی فیصلہ کرے تو اس کے گناہ میں امیر شریک نہ ہوگا[3]

نیز حضرت عمرؓ نے قاضیوں کو جو ہدایتیں دی تھی، ان میں اسلامی عدل گستری کے بنیادی اصول ملتے ہیں۔ ان میں ایک ہدایت نامہ بہت مشہور رہے جو ابو موسیٰ الاشعری کو لکھا تھا جبکہ وہ بصرے کے قاضی بنائے گئے اور جو "کتاب سیاستہ القضاء و تدبیر الحکم" کے موزوں نام سے موسوم ہے[3] یہ ایک طویل فرمان ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں۔

قضاء ایک فریضہ ربانی اور آنحضرت صلعم کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کرو۔ بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے... فریقین سے برابری کا برتاؤ ضروری ہے تاکہ کمزور تمہارے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور ظالم اس سے بیجا فائدہ نہ اٹھائے... بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر کے لئے حلف...

---

[1] اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف الوکیع بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ: ص ۵۶

[2] عزنوس: تاریخ القضاء فی الاسلام (اردو ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء) ص ۴۵، ۴۶

[3] ڈاکٹر حمید اللہ ص ۵۷ (بحوالہ مبسوط ج ۱۶)

فریقین صلح کرنی چاہئیں تو جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں۔ البتہ ایک شرط یہ ہے۔ اس سے حرام چیز حلال اور حلال چیز حرام نہ ہو جائے۔ ۔۔۔۔ فیصلے کے بعد نظر ثانی ہو سکتی ہے کیونکہ اصل مقصد حق رسانی اور انصاف ہے۔۔ فیصلے کے لئے اگر قرآن اور حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو اپنے غور و فکر سے کام لو اور پچھلی نظائر سے قیاس قایم کرو اور ایسا فیصلہ کرو جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔۔۔ اگر مدعی اپنا حق ثابت کرنے کے لئے مہلت مانگے تو مہلت دو۔ اگر شہادت سے دعوے ثابت ہو جائے تو مدعی کے موافق ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کرو۔۔۔ شہادت میں سب مسلمان قابل اعتماد ہیں سوائے ایسے لوگوں کے جو پہلے میں سزا پا چکے ہوں یا جو اس سے پہلے جھوٹی گواہی دے چکے ہوں۔۔ کسی مدعی کے رشتہ دار کی شہادت قابل اعتماد نہیں۔۔۔ مجلس عدالت میں غرور و تکبر روا نہیں۔ لوگوں کو جھڑکنا نہ چاہئے اور حق بات پر ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہیئے۔ خدا سب کو دیکھتا اور سنتا ہے اسی سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہیئے[1]۔

اسی طرح قاضی شریح کو بھی تقرر کے وقت حضرت عمر نے ایک ہدایت نامہ دیا اور تاکید کی تھی کہ کتاب اللہ اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو حق پرست اماموں کے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر یہ اجتہاد کام نہ دے تو اپنی رائے کام میں لائیں اور اہل علم و صلاح سے مشورہ کریں[2]۔ اگر غور کیا جائے تو کسی مملکت میں عدلیہ کی خوبی تین چار باتوں پر منحصر ہے۔ (۱) عمدہ اور مکمل قانون موجود ہو۔ (۲) قابل اور متدین حاکم ہوں (۳) ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جن سے عدالت کے حکام اور کارکن رشوت اور ناجائز وسائل کی طرف مائل نہ ہو سکیں۔ (۴) آبادی کے لحاظ سے حکام یعنی قاضیوں کی تعداد کافی ہو۔

قانون تو قرآن حکیم میں موجود تھا۔ البتہ جزئیات کے لئے حدیث اجماع اور قیاس سے مدد لی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت فاروق رضؓ نے قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات میں پہلے قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کریں۔ قرآن سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے تو حدیث اور حدیث سے بھی نہ

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۲۲۳ - ۲۲۳) (بحوالہ ابن قتیبہ ابن خلدون وغیرہ) نیز ملاحظہ ہو ابن القیم کی کتاب "اعلام الموقعین"۔

[2] ڈاکٹر حمید اللہ بحوالہ ابن القیم۔ مبسوط وغیرہ) ص۱۳ نیز ملاحظہ ہو سنن نسائی۔ کتاب آداب القضاۃ۔

Marfat.com

حل ہو تو اجماع کے ذریعہ طے کریں۔ اگر اس سے بھی حل نہ ہو سکے تو اجتہاد کریں[1] نیز وہ قاضیوں کو مشکل اور اہم مسائل کے متعلق فتوے لکھ کر بھیجتے تھے[2] اور اُن کے فتوے پوری اسلامی دنیا میں گشت کرائے جاتے تھے[3]

خلیفہ قاضیوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ پایہ تخت مدینہ کے قاضی حضرت زید بن ثابت تھے جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ کعب بن سور الازدی جو بصرے کے قاضی تھے بڑے معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے[4] فلسطین کے قاضی عبادہ بن الصامت تھے۔ یہ ان کا بر خمسہ میں شامل ہیں جنہوں نے عہد رسالت میں قرآن حفظ کیا تھا اور سرکار دو عالم نے ان کو اہل صفہ کی تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا[5] کوفے کے قاضی عبداللہ بن مسعود تھے جن کا فضل و کمال محتاج بیان نہیں۔ عبداللہ بن مسعود کے بعد ۱۹ھ میں قاضی شریح مقرر ہوئے جن کو حضرت علیؓ اقضی العرب کہا کرتے تھے۔ ان نامور شخصیتوں کے علاوہ جمیل بن معمر الجمحی، ابو مریم الحنفی، سلیمان بن ... الباہلی، عبدالرحمٰن بن ربیعہ، ابو قرۃ الکندی، عمران بن الحصین وغیرہ عہد فاروقی کے قاضی تھے[6] ابو الدرداءؓ مدینہ کے اور شریح بصرہ کے اور ابو موسیٰ اشعریؓ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے[7] خود حضرت علیؓ کو قضاء کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا[8]

اگرچہ قاضی حاکم صوبہ یا حاکم ضلع کے ماتحت ہوا کرتا تھا لیکن پچھلے اسلامی دور کی طرح قاضیوں کا انتخاب اور تقرر مرکز سے ہوتا تھا بعض دفعہ گورنروں کو بھی ان کے تقرر کی اجازت

---

[1] و [2] :- کنز العمال، ازالۃ الخفا، اخبار القضاۃ وغیرہ میں متعدد فتوے ملتے ہیں۔

[3] حجۃ اللہ ص ۲۲ (بحوالہ شاہ ولی اللہ)

[4] امام ابن سیرین نے ان کے بہت سے فیصلے اور احکام نقل کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ اسد الغابہ فی احوال الصحابہ۔ استیعاب قاضی ابن عبداللہ۔ تذکرہ کعب بن سور الازدی۔

[5] شبلی الفاروق ص ۱۵۸

[6] الفاروق ص ۱۵۹۔ ان کے تذکروں کے لئے ملاحظہ اُسوۂ صحابہؓ از مولانا محمد عبدالعظیم حیدرآبادی مطبوعہ امرتسر۔ ۱۹۲۴ء

[7] عرنوس: ترجمہ اردو ص ۴۴ [8] عرنوس ص ۳۷

دی جاتی تھی[1] مولانا جلال الدین سیوطی نے "حسن المحاضرہ" میں ابن عبد الحکم اور سعید بن عفیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصر کے پہلے قاضی عثمان بن قیس بن ابی العاص تھے۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص والیٔ مصر کو لکھا تھا کہ وہ کعب بن ضنہ کو قاضی مقرر کریں۔ کیوں کہ وہ زمانہ جاہلیت میں بھی فصل خصومات کا کام کرتے تھے۔ کعب نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے عثمان بن قیس بن ابی العاص کو قاضی مقرر کیا وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک اسی عہدے پر فائز رہے[2]

رشوت یا ناجائز وسائل آمدنی کے سدباب کے لئے بھی حضرت فاروقؓ نے بہت سی تدبیریں اختیار کیں مثلاً یہ کہ قاضیوں کو بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ سلیمان ربیعہ کو پانچ سو درہم ماہوار ملتے تھے۔ عام طور پر دولت مند اور معزز اشخاص کا ہی عدلیہ کے عہدوں پر تقرر ہوتا تھا اور اس کی وجہ حضرت عمرؓ یہ بتاتے تھے کہ دولت مند رشوت کی طرف راغب نہیں ہوتا اور معزز آدمی پر کسی کے رعب و داب کا اثر نہیں ہوتا[3] نیز قاضی کو تجارت کی ممانعت تھی غیر مسلموں کو اجازت تھی کہ خود اپنے مقدمات فیصل کرلیں اس طرح اسلامی عدالتوں میں ان کے دیوانی مقدمات بہت کم آتے تھے اور اسی لئے ہر ضلع میں ایک قاضی کافی تھا۔ عہد فاروقی میں نگرانی اور مرافعہ کا نظام بھی بہت ترقی پا گیا۔ حج کے موقع پر عدالتی اور انتظامی تنقیح کا کام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ جملہ صوبہ دار اور حکام عدالت اس وقت مکہ آتے اور حضرت عمرؓ ان کے خلاف دعوے اور مقدمے سنتے اور عہدہ داروں کی لغزشوں پر سخت دار وگیر کرتے[4]

مسجدوں میں عدالتی اجلاس ہوتے تھے اور فریقین مقدمہ سے کوئی رسوم عدالت نہیں لئے جاتے تھے۔ عدالت کے دروازے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ حضرت فاروقؓ نے پہلی دفعہ قید خانے بنوائے۔ سب سے پہلے مکے میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خریدا

---

[1] الکتانی: التراتیب الاداریہ ج ۱ ص ۲۶۹۔
[2] عنوس: (اردو ترجمہ) محولہ صدر ص ۴۹۔
[3] اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف وکیع بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ ص ۵۷۔
[4] شبلی: الفاروق ص ۲۹۷ تا ۳۰۔

Marfat.com

اور اسے قید خانے کے طور پر استعمال کیا۔[1] اس کے بعد ضلعوں میں بھی قید خانے بنوائے۔[2] قید خانوں کی تعمیر کے بعد سزاؤں میں بھی تخفیف ہو گئی۔ مثلاً جب ابو محجن ثقفی نے متعدد دفعہ شراب نوشی کی تو اس جرم میں اس کو آخری بار حد کی بجائے قید کی سزا دی گئی۔[3] نیز حضرت عمرؓ نے بعض مرتبہ جلا وطنی کی سزا بھی دی چنانچہ ابو محجن کو ایک جزیرہ میں بھیج دیا گیا تھا۔[4]

حضرت عمرؓ محکمہ افتاء کی طرف بھی خاص توجہ کرتے تھے۔ خاص قابلیت کے لوگ مفتی مقرر کئے جاتے تھے اور ان کے سوا دوسروں کو فتویٰ دینے کا اختیار نہ تھا۔[5] مثلاً حضرت علیؓ، عثمانؓ، معاذؓ بن جبل، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور ابوہریرہؓ وغیرہ مفتی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ مقررہ مفتیوں کا بھی امتحان لیتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوہریرہؓ سے استفسار کرتے تھے کہ تم نے فلاں مسئلہ میں کیا فتویٰ دیا۔ ایک دفعہ ابوہریرہؓ نے حضرت عمرؓ کے سوال کا جواب دیا تو فرمایا کہ اگر کچھ اور جواب دیتے تو تم کو فتویٰ دینے سے منع کر دیتا۔[6]

پچھلے عہد کی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی عدلیہ کی شان اور عظمت برابر قائم رہی اور قانون کی نظر میں سب برابر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ خود خلیفہ بھی عدالت میں ایک معمولی فرد مملکت کی حیثیت سے آتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک گھوڑا خریدا اور کسی شخص کو سواری کر کے اسے پرکھنے کا حکم دیا۔ اس اثناء میں گھوڑے کو مضرت پہنچی۔ حضرت عمرؓ نے گھوڑا واپس کرنا چاہا۔ مالک

۱: مقریزی جلد ۲ ص ۱۸۷ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ ص ۵۷ بعض حضرات کے خیال میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلی دفعہ قید خانے بنوائے۔ ملاحظہ ہو۔ عبدالرحیم جورسپروڈینس۔ مدراس ۱۹۱۱ء۔ ص ۱۰

۲: بلاذری فتوح البلدان بحوالہ صدر اکثر مفتوحہ اضلاع میں مثلاً کوفہ ایسے قید خانوں کا تذکرہ ہے)

۳: شبلی۔ الفاروق بحوالہ صدر ص ۳۱۱

۴: اسد الغابہ بحوالہ صدر۔ ذکر ابو محجن ثقفی۔ نیز الفاروق شبلی ص ۳۱۱

۵: ازالۃ الخفا بحوالہ صدر ص ۱۳۰

۶: شبلی الفاروق بحوالہ صدر ص ۳۰۳ آنحضرت صلعم مختلف مسائل پر خود فتوے دیتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاوی کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ خلافت کا بھی یہی فرض تھا۔ جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ترقی دی اور اس کا ایک مستقل صیغہ قائم کر دیا۔ ملاحظہ ہو شبلی نعمانی: سیرۃ النبی جلد (۲) طبع دوم ۱۳۳۱ھ ص ۵۹

Marfat.com

نے دینے سے انکار کیا۔ مقدمہ فیصلے کے لئے قاضی شریح کے پاس گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر گھوڑا مالک کی اجازت سے بغرض سواری لیا گیا تھا تو مالک کو واپس لینا چاہیئے ورنہ نہیں حضرت عمرؓ اس انصاف سے خوش ہوئے اور شریح کو کوفے کا قاضی مقرر فرمایا[1]

حضرت عمرؓ اور ایک یہودی قاضی کے پاس مقدمے کر گئے۔ قاضی صاحب خلیفہ کو آتا دیکھ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے حضرت عمرؓ نے قاضی کی اس حرکت کو خلاف اصول عدالت سمجھا اور برطرف کر دیا[2]

خلیفہ کے بیٹے ابو شحمہ (شحمہ) نے شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے اس کو ۸۰ درے لگائے اور اسی صدمے سے وہ مر گئے[3] اسی طرح قدامہ بن مظعون جو ان کے سالے تھے۔ جب اسی جرم میں ماخوذ ہوئے تو ان کو بھی علانیہ ۸۰ درے لگوائے[4]

ابی بن کعب اور خلیفہ میں کچھ تنازع ہوا۔ ابی نے زید بن ثابت کے پاس مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمرؓ مدعی علیہ کی حیثیت سے حاضر عدالت ہوئے۔ زید نے آپ کی تعظیم کی تو فرمایا کہ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔ اس کے بعد ابی کے برابر بیٹھ گئے۔ ابی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور حضرت عمرؓ کو دعوے سے انکار تھا۔ ابی نے قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ کو حلف دینا چاہا۔ زید نے خلیفہ کا خیال کر کے ابی سے درخواست کی کہ امیرالمومنین کو قسم سے باز رکھو۔ حضرت عمرؓ اس طرفداری سے رنجیدہ ہوئے اور فرمایا "جب تک تمہارے نزدیک ایک فرد مملکت اور عمر دونوں برابر نہ ہوں تم منصب قضا کے قابل نہیں[5]"

ایک مقدمہ میں حضرت عمرؓ نے ایک مبینہ حدیث سے بھی اختلاف کیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا طلاق بائن کے بعد زمانہ عدت میں عورت کو شوہر کے مکان میں سکونت اور نان و نفقہ کا حق ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ فرمایا کہ نفقہ کا حق ہے اور جب فاطمہ بنت قیس نے اس فیصلے کے

---

[1] حمید اللہ بحوالہ صدر ص ۲۲، ۲۳
[2] عبدالرحیم: جورسپروڈنس مدراس ۱۹۱۱ء ص ۲۱
[3] شبلی ـ الفاروق بحوالہ صدر ص ۴۲۹ حمید اللہ بحوالہ صدر ص ۲۳ ـ نیز ملاحظہ ہو معارف ابن قتیبہ ذکر اولاد عمرؓ
[4] شبلی الفاروق بحوالہ صدر ص ۴۲۸
[5] " " " ص ۳۰۴

خلاف ایک حدیث پیش کی تو حضرت عمر نے فرمایا کہ "ممکن ہے کہ اس عورت نے حدیث کو اچھی طرح یاد نہ رکھا ہو"[1] ایک شاعر کے مقدمہ میں حضرت عمر نے دوسرے شاعر کو بطور ماہر طلب کیا اور اس کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا[2]

فدک کے مسئلے میں حضرت عمر نے حضرت صدیق اکبر کی پیروی کی کہ مفتوحہ علاقے اور ان کی متعلقہ جائداد اسلامی حکمران کی نہیں بلکہ مسلم جماعت کی ملک[3] ہے۔ حضرت عمر نے اپنی ایک مملوکہ زمین، جو خیبر میں تھی وقف کر دی تھی۔ اور یہ پہلا وقف تھا۔ جو آنحضرت کے زمانے ہی میں آپؐ کے مشورے سے عمل میں آیا تھا[4]۔ لیکن مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا وقف اس وقت ہوا تھا جبکہ آنحضرت نے مدینہ منورہ کی مسجد کی بنیاد رکھی تھی[5]

حضرت عثمان ایک نرم دل خلیفہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے عدل گستری سے متعلق جو اضافے کئے۔ وہ ان کے زمانے میں بحال رہے۔ ان کے عہد میں ایک عمارت "دار القضاء" کے نام سے بنائی گئی[6] ورنہ اب تک مسجدوں میں قاضی کے اجلاس ہوتے تھے۔

حضرت علیؓ کا عدل[7]۔

خلیفہ چہارم حضرت علی ایک بڑے فقیہ تھے اور خاص طور پر قانون وراثت میں انہیں انتہائی مہارت حاصل تھی۔ ان کے فیصلوں کے حضرت عمر بھی قائل تھے چنانچہ حضرت عمر نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس سے فرمایا تھا "جب کبھی کوئی قابل اعتماد شخص مجھ سے حضرت علی کا فیصلہ سناتا ہے تو میں اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرتا"

---

[1] محمد اللہ صفحہ (۲۲)

[2] مولانا شبلی: الفاروق صفحہ ۱۶۰ شاعر حطیہ کا مقدمہ جس میں حسان بن ثابت کی رائے لی گئی۔

[3] محمد اللہ صفحہ (۲۵-۲۶)۔

[4] امیر علی محمڈن لا۔ جلد ۱ صفحہ (۱۵۲)

[5] شبلی سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ (۲۴۱)

[6] ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ (۳۵)۔ بحوالہ الکتانی)۔ نیز حفیظ صدیقی: اسلامی عدل گستری محولہ صدر صفحہ ۳۰

[7] محمد اللہ صفحہ (۲۶)۔ سیوطی کی تاریخ الخلفاء اردو ترجمہ خلیل الرحمن مطبع صدیقی لاہور ۱۹۴۰ء صفحہ ۹۲ پر حضرت عمرؓ کا یہ قول درج ہے کہ علیؓ تو ہم سب میں علم قضا کے بہت بڑے عالم ہیں۔

قانون وراثت میں آپ عول اور رد کے اصول کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ قانون شہادت کے سلسلے میں حضرت علیؓ نے ایک نئی اصلاح کی۔ پیش ہونے والے گواہوں کا "تزکیہ" کہ زیادہ معتبر ہیں یا نہیں۔ یہ اہل محلہ کی رائے سے قبل از وقت کیا جاتا تھا۔ قاضی شریح گواہوں کی حیثیت اور صداقت کے متعلق مخفی طور پر تحقیقات کرتے تھے۔ لیکن حضرت علیؓ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جھوٹے گواہوں کی شہادت لیتے وقت دوسرے گواہوں کو عدالت سے ہٹا دیتے تھے [1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم سات چیزوں میں دوسرے لوگوں سے افضل ہو گے ان سات چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم امور الٰہی میں بہتر قاسم ہو اور دوسرے یہ کہ فصل خصومات میں بہت بڑے قاضی ہو [2] شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے خود عہد نبوی میں بھی قضا کے فرائض انجام دیئے آنحضرتؐ نے آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا [3]

حضرت علیؓ اپنے پیشرو خلفاء کو بھی فصل خصومات میں مشورہ دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ کسی مجنون عورت نے چھ ماہ میں بچہ جنا تو حضرت عمرؓ نے خیال کیا کہ نکاح سے حمل کے دس ماہ پورے نہیں ہوئے۔ اس لئے اس کو سنگسار کیا جائے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایک تو مجنون ہونے کی وجہ سے وہ قابل معافی ہے۔ دوسرے خدا فرماتا ہے کہ حمل اور رضاعت کے ۳۰ مہینے ہیں ——— ۲۴ مہینے دودھ پلانے کے اور چھ مہینے حمل کے۔ اس طرح تیس مہینے ہو جاتے ہیں اس مشورے پر حضرت عمرؓ نے کہا "اگر علیؓ نہ ہوتے تو میں غلطی کر کے ہلاک ہو جاتا" [4]

عدلیہ کی جو وقعت اور شان عہد نبوی اور پھر تینوں خلفاء کے عہد میں تھی، وہ حضرت علیؓ کے عہد میں بھی باقی رہی۔ دوسرے الفاظ میں صدر مملکت کا بالکلیہ قانون مملکت کے تابع ہونا۔ اور یہ تصور کبھی پیدا نہ ہوا کہ مقتدر اعلیٰ قانون سے بالاتر چنانچہ حضرت علیؓ کے عہد میں ایسی

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۶۰ بحوالہ حاجی محمد بن عبداللہ سوانح اہل بیت النبی الابرار حیدرآباد ۱۳۶۰ھ ص ۱۲۲

[2] کنز العمال ج ۵ ص ۳۴۳ (مطبوعہ حیدرآباد دکن)

[3] سیوطی تاریخ الخلفاء اردو ترجمہ خولہ صدر ص ۹۲

[4] حاجی محمد بن عبداللہ سوانح عمری اہلبیت النبی الابرار حیدرآباد دکن ۱۳۶۰ھ ص ۶۰

مثالیں بھی ملتی ہیں کہ آپ بذات خود عدالت میں قاضی کے روبرو بہ حیثیت فریق مقدمہ حاضر ہوئے، چنانچہ آپ قاضی شریح کے پاس ایک مقدمہ لے گئے اور اپنے بیٹے امام حسن رضؓ کو بطور گواہ پیش کیا۔ قاضی شریح نے باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انصاف سے حضرت علی رضؓ اتنے خوش ہوئے کہ قاضی شریح کی تنخواہ پانچ سو درہم کر دی[1]

پچھلے دور کی طرح حضرت علی رضؓ یا تو خود قضاۃ کا تقرر کرتے یا والی کو اس تقرر کا اختیار دے دیتے۔ چنانچہ آپ نے ایک خط کے ذریعہ والی مصر کو قاضی کے تقرر کا اختیار دیا تھا۔ اس خط سے جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے، قاضی کی قابلیت اور صفات کا تعین ہوتا ہے:۔

"لوگوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے ایسے معزز شخص کو مقرر کرو۔ جو تمہارے نزدیک رعایا میں سب سے بہتر ہو۔ جس کی وجہ سے رعایا کے فصل خصومات میں دقت ہو نہ اہل معاملہ کو خوشامد کی ضرورت پیش آئے۔ جو غلطی پر اصرار نہ کرے اور حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہو۔ جس کا نفس طمع کی طرف مائل نہ ہو۔ جو مقدمات کی سماعت سرسری طور پر نہ کرے۔ بلکہ پوری توجہ سے فریقین کی باتیں سنے۔ فریقین کے معاملات پر اس کی گہری نظر ہو۔ شبہ کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہو۔۔۔ معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے انتہائی احتیاط غور و فکر اور صبر و استقلال سے کام لے اور جب کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو سختی کے ساتھ اس کی تعمیل کرائے اور اس کے نفاذ میں دیر نہ کرے۔ سفارش اور حرص و طمع کو فیصلوں کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔ اگرچہ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن قاضی کو ان صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔۔۔ جب تم کسی شخص کو قاضی مقرر کرو تو اس کو کافی تنخواہ دو تاکہ اس کی ضروریات زندگی اس کو رشوت ستانی پر مجبور نہ کریں۔ اس کی قدر و منزلت تمہارے دل اور تمہاری مجالس میں اتنی ہونی چاہیئے کہ کوئی شخص اس کے خلاف تمہارے کان بھرنے کی جرأت نہ کر سکے"[2]

حضرت علی کے متعدد فیصلے دستیاب ہوتے ہیں اور اگر ان کو مضمون وار جمع کر دیا جائے تو نظائر کا ایک اچھا مجموعہ بن سکتا ہے[3] ان سے بہت سی تفصیلی باتوں پر روشنی پڑتی ہے جو ہمارے

---

[1] سرخسی مبسوط جلد (۱۶) مطبع السعادہ مصر ۱۳۲۴ھ ص ۱۲۲

[2] عنوس: (ترجمہ اردو) محولہ صدر ص ۴۶-۴۸۰

[3] حضرت علی رضؓ کے جملہ ۱۴۱ فیصلے مولانا حاجی محمد بن عبداللہ نے بڑی محنت سے یکجا جمع کر دیئے ہیں

(آئندہ صفحہ

Marfat.com

لئے آج بھی مفید ہو سکتی ہیں۔

حضرت علیؓ کے بعض اہم فیصلے:۔

مقدمات از قسم دیوانی وراثت کا ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک ایسے لڑکے کی وراثت زیر بحث طلب تھی جس کے دو سر دو سینے تھے لیکن نچلا دھڑ ایک ہی تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کو ایک حصہ ملے گا یا دو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اسے سونے دو اور پھر دیکھو کہ سانس دونوں سروں سے برابر آتی ہے یا نہیں۔ اگر دونوں سروں سے سانس برابر آئے تو دو حصے ہیں گے اور اگر ایک ہی سر سے سانس آتی ہے تو ایک ہی حصہ[1]

یمن میں آپ کے اجلاس میں تین شخص آئے۔ ان میں سے ہر شخص ایک لڑکے کو اپنا بیٹا بتاتا تھا آپ نے تینوں پر قرعہ ڈالا۔ جس شخص کے نام قرعہ نکلا، اس کے حوالے کیا اور اس سے دو ثلث دیت دوسروں کو دلوائی[2]

ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا، بعد کو معلوم ہوا کہ وہ اس کی رضاعی بہن ہے خلوت نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ عورت کو جو مہر دیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے۔ وہ واپس کر دیا گیا۔ پھر دونوں میں تفریق کرا دی[3]

ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔ خلوت سے پہلے وہ مر گیا۔ حضرت علیؓ نے وارث قرار دیا اور عدت کی پابندی عاید کی لیکن مہر نہیں دلایا[4]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس وراثت کا ایک مقدمہ آیا۔ آپ نے حضرت علیؓ سے استصواب کیا۔ حضرت علیؓ نے لکھا کہ مال کے سات حصے کئے جائیں۔ ان میں سے ایک حصہ ماں کو دیا جائے اور چھ حصے چھ بہنوں میں تقسیم کر دیئے جائیں[5]

(پچھلے صفحے) ملاحظہ ہو سوانح اہلبیت النبی الابرار مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۶۰ھ ص ۱۱۴ تا ۲۰۴

۱۔ الطرق الحکمیہ ص ۵۲ بحوالہ سوانح اہلبیت خولہ صدر ص ۱۲۸

۲۔ بیہقی ج ۱۰ ص ۲۶۷ 〃 ص ۱۴۸ تا ۱۴۹

۳۔ کنز العمال بحوالہ سوانح اہلبیت ص ۱۸۱ تا ۱۸۲

۴۔ کنز العمال جلد ۴ ص ۲۱۲ بحوالہ سوانح اہلبیت خولہ صدر ص ۱۹۰

۵۔ 〃 ص ۲۱۲ 〃 ص ۱۹۶ تا ۱۹۷

Marfat.com

ایک رات کو دو عورتوں کی ایک ہی جگہ زچگی ہوئی۔ ایک کے لڑکا ہوا اور دوسرے کے لڑکی۔ نافی الذکر نے اپنی لڑکی کو لڑکے سے بدل لیا۔ لڑکے کی ماں اپنے لڑکے کی دعویدار تھی۔ مقدمہ حضرت علیؓ کے پاس آیا آپ نے حکم دیا کہ دونوں کے دودھ کا وزن کر لیا جائے جس کے دودھ کا وزن زیادہ ہو، اسی کا لڑکا ہے [1]

مقدمات از قسم فوجداری ایک عورت نے اپنی شادی کی پہلی رات اپنے کسی آشنا کو چوری چھپے بلوایا۔ جب اس کا شوہر پلنگ کے پاس آیا تو اس شخص نے شوہر پر حملہ کیا۔ شوہر نے اسے قتل کر دیا۔ پھر عورت نے اپنے شوہر کی جان لی۔ حضرت علیؓ نے اس مقدمہ کے فیصلے میں پہلے عورت کو حکم دیا کہ وہ اپنے آشنا کا خون بہا ادا کرے پھر شوہر کے قصاص میں قتل کی جائے [2]

ایک نوجوان چند لوگوں کو ساتھ لے کر حاضر ہوا اور قاضی شریح کے ایک فیصلے کے خلاف مرافعہ پیش کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس نوجوان کا باپ ان لوگوں کے ساتھ سفر پر گیا اور جب لوگ واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ اس کا باپ مر گیا اور جائداد سے متعلق انہوں نے یہ بیان کیا کہ مرحوم نے کچھ نہیں چھوڑا حالانکہ وہ بہت سا مال ساتھ لے گیا تھا۔ قاضی شریح نے گواہ طلب کئے لیکن نوجوان اس امر کی شہادت پیش نہ کر سکا کہ ان لوگوں ہی نے اس کے باپ کو قتل کیا ہے۔ اس پر قاضی نے ان لوگوں کو حلف دی اور اس کے بعد ان کو چھوڑ دیا۔ جب مرافعہ حضرت علیؓ کے پاس آیا تو آپ نے ان لوگوں کو عہدہ دار پولیس کے حوالہ کیا اور ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کا حکم دیا۔ پھر ان میں سے ایک ایک آدمی طلب کیا جاتا۔ حضرت علیؓ اس کا بیان لیتے اور کاتب قلمبند کرتا جاتا۔ حضرت علیؓ نے ہر ملزم سے متعدد سوال کئے۔ مثلاً یہ کہ تم لوگ کس دن سفر پر روانہ ہوئے۔ پہلی منزل کہاں ہوئی۔ سفر کے حالات کیا تھے۔ وہ کس طرح بیمار ہوا۔ کس طرح مرا۔ اس کا مال کہاں ہے۔ اس کو غسل کس نے دیا۔ اس کا کفن دفن کس طرح ہوا؟ نماز جنازہ کس نے پڑھی۔ دفن کہاں کیا گیا وغیرہ۔ ان تمام سوالوں کے جوابات کاتب لکھتا جاتا تھا جب پہلے شخص کا بیان ختم ہو گیا تو حضرت علیؓ نے بلند آواز سے اللہ اکبر فرمایا اور آپ کے ساتھ تمام حاضرین نے اللہ اکبر کہا۔ بقیہ ملزموں کو خبر نہ تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ البتہ ان نعروں سے

---

[1] سوانح اہلبیت صہ ۲۰۴

[2] الطرق الحکمیہ صہ ۵۰ بحوالہ سوانح اہلبیت صہ ۲۰۵

وہ اتنا ضرور خیال کرتے تھے کہ پیش شدہ گواہ نے صحیح بات بتا دی۔ جب دوسرا گواہ پیش ہوا تو اس سے فرمایا کہ تیری دشمنی ظاہر ہو گئی ہے اور اب تیرے لئے سزا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ سچ سچ بتا دے۔ جب اس کا بیان قلمبند ہوا تو اس وقت بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اسے قید خانے لے جانے کا حکم دیا۔ اسی طرح ہر گواہ کے وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا گیا۔ بعد میں پیش ہونے والے گواہ یقین کرتے جاتے تھے کہ ان کے پیشرووں نے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ سب کے آخر میں جو گواہ پیش ہوا اسے حضرت علیؓ نے بہت ڈانٹا اور پھر اس سے سوال کیا۔ اس نے کہا "میں اس چیز کو قطعی ناپسند کرتا تھا لیکن ان لوگوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔" اس کے بعد تمام افراد سے اس جرم کے متعلق دریافت کیا تو سب نے اقبال کر لیا۔ اس تحقیقات کے بعد آپ نے ان تمام لوگوں کو حکم دیا کہ جان اور مال کا تاوان ادا کریں۔[1]

دو آدمیوں کے خلاف استغاثہ پیش ہوا۔ یہ غلام نہیں بلکہ آزاد تھے لیکن باری باری سے ایک دوسرے کو غلام بتا کر فروخت کر دیتے تھے۔ ایک شہر میں اس طرح فروخت کے بعد دونوں وہاں سے بھاگ جاتے اور یہی بیوپار دوسرے شہر میں کرتے۔ حضرت علیؓ نے فیصلہ کیا کہ ایک تو ان پر دھوکے کا الزام ہے۔ لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے کو بیچتے تھے۔ دوسرے چوری کا الزام ہے کہ لوگوں کا مال لے کر فرار ہو جاتے تھے۔ اس لئے حکم دیا کہ دونوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔[2]

قتل کا ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص کسی گلی میں خون آلود چھرے کے ساتھ پایا گیا۔ اس کے سامنے ایک مقتول خون میں لوٹ رہا تھا۔ چند آدمی جو ادھر سے گزر رہے تھے اس کو اسی حالت میں گرفتار کر لائے۔ اس شخص نے اقبال کر لیا کہ وہی قاتل ہے۔ حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ اسے قتل کیا جائے۔ جب اس کو روانہ کیا گیا تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ اس کے قتل میں جلدی نہ کرو۔ امیر المومنین کے پاس چلو کیونکہ میں اصلی قاتل ہوں۔ یہ سب حضرت علیؓ کے دربار میں آئے۔ خلیفہ نے پہلے شخص سے دریافت فرمایا کہ تو نے اقبال جرم کیوں کیا تھا۔ اس نے کہا "میں قصاب ہوں۔ آخری شب میں نے اپنی دوکان سے باہر نکل کر گائے کو ذبح کیا تھا۔ ہاتھ

---

[1] سوانح اہلبیت محمد صدر صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۲۔ نیز ملاحظہ ہو بیہقی جلد ۸ صفحہ ۱۴۱

[2] الطرق الحکمیہ صفحہ ۲۹ بحوالہ سوانح اہلبیت صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵

میں چھری تھی۔ پیشاب زور سے آیا تو اسی حالت میں پیشاب کو گیا۔ واپس ہو رہا تھا۔ تو یہ مقتول گلی میں خون آلود پڑا تھا۔ لوگوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا اور گرفتار کر لیا۔ میں نے خیال کیا کہ بغیر اعتراف کے کوئی چارہ نہیں۔" دوسرے شخص نے کہا کہ میں بہت مفلس ہوں۔ مال حاصل کرنے کے لئے میں نے یہ قتل کر دیا۔ جب یہ لوگ گلی کی طرف آنے لگے تو میں فرار ہو گیا۔ آپ نے قصاص کا حکم صادر فرمایا تو مجھے خوف ہوا۔ میری گردن پر دو خون عائد ہو جائیں گے۔ اس لئے میں نے آکر حق بات بتا دی۔ حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ سے رائے طلب کی تو آپ نے فرمایا "اگرچہ اس شخص نے ایک کو قتل کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی دوسرے کی جان بچائی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ جس نے ایک نفس کو موت سے بچایا گویا اس نے تمام لوگوں کو موت سے بچایا۔" اس پر حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ دونوں کو چھوڑ دیا جائے اور مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔[1]

ایک شخص پر اونٹ کی چوری کا الزام تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا "میرے خیال میں تم نے چوری نہیں کی"۔ اس نے کہا "میں نے چوری کی ہے"۔ پھر فرمایا "شاید تم کو شبہ ہو گیا ہے"۔ کہا "نہیں میں نے چوری کی ہے"۔ آپ نے قنبر کو حکم دیا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ اور اگر جلاکہ قصاب کو بلاؤ کہ اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ قصاب کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو آپ نے پھر اس سے دریافت کیا۔ اس نے کہا "میں نے چوری نہیں کی"۔ اس پر آپ نے اسے چھوڑ دیا لوگوں نے اعتراض کیا کہ اقبال کے باوجود ملزم کو چھوڑ دیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ "اقبال پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ اب اسی کے انکار پر چھوڑ دیا"۔[2]

ایک شخص پیش ہوا۔ اس نے صرف نقب لگایا تھا۔ چوری نہیں کی تھی۔ آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ چند کوڑے لگوا دیئے۔[3]

ایک ملزم پر سرقہ کا الزام تھا۔ آپ نے اس کو قید کر دیا اور دو دوسرے روز گواہوں کے ساتھ طلب فرمایا۔ معلوم ہوا کہ ایک گواہ بھاگ گیا۔ آپ نے چور کو چھوڑ دیا اور سزا نہیں دی

---

[1] الطرق الحکمیہ بحوالہ سوانح اہلبیت صہ ۱۳۱ تا ۱۳۴

[2] کنز العمال ج ۲ صہ ۴۳۷ بحوالہ سوانح اہلبیت محولہ صدر صہ ۱۴۳

[3] " " صہ ۲۰۳ " " صہ ۱۴۵

Marfat.com

جب تک دو گواہ پیش نہ ہوں آپ حد کی سزا نافذ نہیں فرماتے تھے۔ اور جب گواہ انکار کر دیتے تو ملزم کو چھوڑ دیتے تھے[1]

دو شخص ایک چور کو پکڑ لائے اور گواہی دی کہ اس نے چوری کی ہے ان کی شہادت پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر وہی دو گواہ ایک اور شخص کو لے آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے پچھلی دفعہ غلطی کی تھی۔ اصل چور یہ شخص ہے۔ حضرت علیؓ نے پہلے شخص کو ان گواہوں سے دیت دلوائی اور فرمایا:" اگر یہ ثابت ہوتا کہ تم نے یہ کام قصداً کیا تو میں تم دونوں کے ہاتھ کٹوا دیتا[2]"

مقدمات از قسم "ثالث" قارصہ، قامصہ اور واقصہ تین لڑکیاں آپس میں کھیل رہی تھیں۔ ایک کے اوپر دوسری اور دوسری پر تیسری سوار تھی کہ نیچے والی نے دوسری کو گرا دیا اور تیسری اس طرح گر پڑی کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ آپ نے پہلی اور دوسری پر دو ثلث دیت مقرر فرمائی اور تیسری کو گردن ٹوٹنے کی وجہ سے دو ثلث دیت ادا کی گئی[3]

ایک شخص کے دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا تھا۔ تاوان بقدر نقصان دلوایا اور فرمایا کہ ایک سال تک انتظار کرو۔ اگر دانت ایک سال کے بعد سیاہ ہو جائے تو پوری دیت دلائی جائے گی[4]

ایک عورت نے روند کر ایک شیر خوار بچے کو مار ڈالا۔ حضرت علیؓ کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا۔ دس عورتوں نے گواہی دی۔ دیت کا حکم ہوا اور خلیفہ نے دو ہزار اپنے پاس سے ادا کئے[5]

عہد نبوی میں جب حضرت علیؓ یمن کے قاضی تھے آپ کے سامنے ایک مقدمہ آیا۔ چند لوگوں نے شیر پکڑنے کے لئے ایک گہرا کنواں کھود رکھا تھا اور وہ اوپر سے کھلا تھا۔ جن آدمی اس پر چڑھ کر دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کو ہٹا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک شخص اپنے کو سنبھال نہ سکا اور گڑھے میں گرنے لگا۔ اس حالت میں اس نے دوسرے کو تھام لیا۔ اسی طرح دوسرے نے تیسرے کا سہارا لیا اور تیسرے نے چوتھے کو پکڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں کنویں میں گر پڑے

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۲۰۳ بحوالہ سوانح اہلبیت محولہ ص ر ص ۱۴۵

[2] 〃 〃 ۳ ص ۴۳۸ 〃 〃 ص ۱۴۶، ۱۴۷

[3] بیہقی ج ۸ ص ۱۱۲ و نہایۃ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۲ بحوالہ سوانح اہلبیت ص ۱۵۷، ۱۵۸

[4] 〃 〃 ص ۹۱ بحوالۂ سوانح اہلبیت ص ۱۵۳

[5] طرق الحکمیہ ص ۱۳۰ بحوالہ 〃 ص ۱۳۹

Marfat.com

اور شیر نے ان چاروں کو زخمی کر دیا۔ اوپر سے کسی نے برچھی سے شیر کو مار ڈالا لیکن یہ چاروں زخمی ہلاک ہو گئے۔ اس پر پہلے شخص کے ورثاء دوسرے شخص کے ورثاء سے آمادۂ جنگ ہو گئے۔ حضرت علیؓ ان لوگوں کے پاس گئے اور تاکید فرمائی کہ آپس میں لڑنا نہیں چاہیئے۔ پھر ان کا یہ فیصلہ فرمایا کہ ان تمام قبائل پر جنہوں نے اس گڑھے پر ہنگامہ برپا کیا ربع، ثلث، نصف اور کامل دیت عائد ہو گی۔ پہلے شخص کے لئے ربع دیت ہے۔ کیونکہ دوسرے شخص نے اس کو اوپر گر کے ہلاک کیا۔ دوسرے کے لئے ثلث دیت ہے تیسرے کے لئے نصف دیت اور چوتھے کے لئے کامل دیت۔ حضرت علیؓ کے اس فیصلے سے سب فریق ناراض ہوئے اور آنحضرتؐ کے پاس مرافعہ کیا لیکن دربار رسالتؐ سے یہی فیصلہ بحال رہا۔[1]

ایک شخص حد شرعی کے نفاذ میں مر گیا۔ ورثاء نے مقدمہ پیش کیا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ جو شخص حد میں مرے اس کا تاوان نفس نہیں ہوتا کیونکہ وہ حدود اللہ کی ادائیگی میں مرتا ہے۔[2]

زبانی ہتک عزت کے ازالہ کے ایک مقدمہ میں حضرت علیؓ نے فیصلہ فرمایا کہ "اگر کسی شخص نے کسی کو کافر یا خبیث یا فاسق یا گدھا کہا تو اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ حاکم وقت اپنی صواب دید سے تعزیر عاید کر سکتا ہے"۔[3]

عدل گستری اموی اور عباسی دور میں

امیر معاویہ حضرت عثمان کے زمانے میں شام کے گورنر تھے لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ طاقت حاصل کی اور حضرت عثمان کے بعد خود خلافت کے دعویدار بن گئے اور خلیفہ چہارم حضرت علی کی مخالفت کرنے لگے اور بعد میں خود خلیفہ ہو گئے

امیر معاویہ کے بعد ان کا بیٹا یزید خلیفہ ہو گیا۔ گویا خلافت[4] موروثی ہو گئی۔ اس زمانے میں وہ جمہوری ادارے ختم ہو گئے جو خلفاء راشدین کے زمانے میں قائم تھے۔ یزید کے بعد اور بھی خلفا ہوئے لیکن یہ دراصل موروثی خلافت تھی اور بنی امیہ کی پوری تاریخ

---

[1] کنز العمال ج ۵ ص ۲۷ بحوالہ سوانح اہلبیت ص ۱۱۵ تا ۱۱۸

[2] " " " ۲ " ص ۴۴۳ " " " محولہ صدر ص ۱۳۲

[3] " " " " ص ۴۴۱ " " ص ۱۶۵

[4] ماوردی۔ احکام السلطانیہ ترجمہ اردو صفحہ (۱۲۳)۔(۱۳۵)

میں صرف ایک خلیفہ ایسے ہیں جن کو مسلمان خلیفہ صالح اور پانچویں خلیفہ راشد سمجھتے ہیں۔ یہ عمر ابن عبد العزیز ہیں جو ایک بڑے متقن اور فقیہ تھے۔ ان کے عہد میں علم اصول فقہ میں بڑی ترقی ہوئی۔[1]

قاضی اور اس کے اختیارات اموی دور میں عدل گستری قاضیوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ جن کو خلیفہ مقرر کرتا تھا اور بقول ماوردی قاضیوں کے تقرر اور ان کی علیحدگی کے متعلق عام اعلان ہوتا تھا۔[1] اختیارات کے لحاظ سے قاضیوں کی دو قسمیں تھیں۔ یعنی وزرا کی طرح قاضی بھی محدود اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ مقرر ہوتے تھے۔ فرمان تقرر میں ان کے اختیارات کی صراحت ہوتی تھی اور قاضی ان اختیارات کے پابند تھے۔ جو قاضی وسیع اختیارات کے ساتھ مقرر ہوتے تھے، ان کے حدود اختیارات بہت وسیع تھے اور بعض مرتبہ انتظامی فرائض بھی ان کے سپرد ہوتے تھے، جن میں سے بعض یہ ہیں[2]

(۱) ولی کا تقرر۔

(۲) موقوفہ جایدادوں کا انتظام۔

(۳) قانون کی مقرر کردہ سزاؤں کا نفاذ اور تعمیل۔

(۴) وصیت سے متعلق امور کی نگرانی۔

(۵) ماتحت قاضیوں اور عدلیہ کے دیگر عہدہ داروں شہود و امنا وغیرہ کی نگرانی۔

(۶) نماز جمعہ کی امامت۔

مرافعوں کی سماعت اس زمانے میں کوئی باضابطہ عدالت مرافعہ نہ تھی البتہ مرافعوں کی سماعت کے لئے ایک مجلس ضرور قایم تھی۔ عدلیہ کا پورا انتظام "ناظر المظالم" کے تابع تھا۔ جس کا فرض تھا کہ غلط فیصلوں کی نظر ثانی کرے۔ خلفاء راشدین تو خود شکایتیں سنتے اور مقدمے فیصل کرتے تھے شاید اس کے اتباع میں عبد الملک کے عہد میں "یہ مجلس" قائم ہوئی اور خود عبد الملک مرافعوں کی سماعت کرتا تھا۔[3] پیچیدہ مسایل میں قاضی ابو ادریس اوزاعی عبد الملک کو مشورہ دیتے تھے۔[3]

---

[1] محمد اللہ صفحہ (۳۰)

[2] خدا بخش محولہ صدر صفحہ (۲۸۸)

[3] خدا بخش محولہ صدر صفحہ (۲۸۸)

بعد میں عمر ابن عبد العزیز نے لوگوں کی شکایتیں اور مرافعے سننے کا خاص انتظام کیا اور وہ خود مرافعے سنتے تھے[۱] بعد کے اموی خلفا نے اسی طریقے کی پیروی کی اور فان کریمر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسی ادارے کو دیکھ کر سسلی کے نارمنی بادشاہ راجر نے اپنے ہاں بھی ایک ایسی ہی مجلس (کیوریہ) بنائی تھی۔[۲]

حضرت عمر بن عبد العزیز کے قول کے مطابق قاضی میں حسب ذیل پانچ صفات کی موجودگی ضروری تھی۔ یہ سب صفات موجود ہوں تو قاضی کامل ہے ورنہ ناقص قرار دیا جائے گا۔

(۱) تقرر سے پہلے کے واقعات کا علم ہو۔

(۲) حرص اور طمع سے نفرت ہو۔

(۳) بردبار ہو اور مخالف کے ساتھ بھی تحمل سے پیش آئے۔

(۴) ائمہ فقہ کا متبع ہو

(۵) اہل علم اور اہل الرائے اصحاب کے ساتھ میل جول رکھتا ہو۔

وہ خود ان امور کو ملحوظ رکھ کر قاضیوں کا تقرر کرتے تھے[۳]

قاضی کا تقرر خلیفہ کرتا تھا۔ بعض اوقات والی کو لکھا جاتا تھا کہ فلاں شخص کو قضاء کا کام دیا جائے اور کبھی کبھی تقرر کا پورا اختیار عامل کو دیا جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ بغداد کے مؤلف نے (جزو ۱۴ صفحہ ۱۰۱) یحییٰ بن سعید قاضی حیرہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یحییٰ بن سعید بنو امیہ کے زمانے میں مدینہ کا قاضی تھا۔ بنو ہاشم (بنو عباس) کے زمانے میں اس کو عراق کا قاضی بنایا گیا۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے زمانے میں یوسف بن محمد ثقفی نے قضاء کا عہدہ سپرد کیا تھا۔ کیونکہ خلفاء کی طرف سے علاقوں کے والیوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ قاضیوں کا تقرر اپنی پسند سے کرتے تھے۔ یہ حالت ابو جعفر منصور کے خلیفہ ہونے تک قائم رہی[۴]

قاضی عام طور پر خلیفہ وقت کو لکھ کر اہم معاملات میں رائے طلب کرتے تھے۔ چنانچہ قاضی

۱۔ خدا بخش محولہ صدر صفحہ (۲۴۸)

۲۔ محمد اللہ صفحہ (۱۳۰) نیز ملاحظہ ہو خدا بخش ہسٹری آف اسلامک سویلیزیشن صفحہ (۲۸۹)

۳۔ عنوس: ترجمہ اردو ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ ۱۹۶۰ء

۴۔ " " " صفحہ ۴۶-۴۸

مصر عیاض بن عبداللہ ازدی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ پہلے حق شفعہ قریب ترین پڑوسی کو حاصل ہوتا تھا اور وہ نہ لینا چاہے تو اس سے قریبی پڑوسی کو یہ حق ملتا تھا۔ موجودہ حالات میں کیا عمل کرنا چاہیئے۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ اب شفعہ کا حق صرف شریک کو حاصل ہے۔ لوگوں نے اپنے مکانوں اور زمینوں میں داخل ہونے کے لئے علیحدہ علیحدہ راستے بنا لئے ہیں تو پھر ان کو حق شفعہ کیوں دیا جائے۔[1]

خلفاء راشدین اور بنو امیہ کے زمانے میں عام طور پر قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے کسی مخصوص شخص کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں قاضیوں کو پوری آزادی حاصل تھی [illegible] اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کریں۔ چنانچہ توبہ بن نمر حضرمی جو ہشام بن عبدالملک کے عہد میں مصر کے قاضی تھے اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ ان لوگوں کی جائدادوں پر سرکاری نگرانی قائم کی جائے جو بے دردی سے اپنا مال ضائع کرتے اور فضول خرچی کرتے تھے۔ اسی طرح امیر حکم بن ہشام اسپین کے قاضی محمد بن بشیر معافری نے جو امام مالک کے ہم عصر تھے وزیر ابن فطیس کے خلاف فیصلہ دیا تو ہاں مقدمہ کے نام بھی وزیر کو نہیں بتائے [illegible] کیا کہ جرح کا موقع کیوں نہیں دیا۔ قاضی نے جواب دیا کہ گواہوں کو عدالت کے [illegible] محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔[2]

بنی عباس: ابو العباس السفاح عباسیوں کے پہلے خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی ابو جعفر کو جانشین نامزد کیا۔ ابو جعفر ہی کو عباسی خلافت کا اصل بانی سمجھنا چاہیئے۔ [illegible] خلیفہ تو غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے اور خاص طور پر ہارون کا زمانہ [illegible] باب ہے۔ کیونکہ اسی دور میں فقہ حنفی کو بہت عروج ہوا امام ابو حنیفہ کے [illegible] ابو یوسف اس وقت قاضی القضاۃ تھے۔ عباسی خلفاء [illegible] افراد [illegible] بیعت کرتے تھے اور اس اجماع الامت کے ذریعہ ان خلفاء کو [illegible] اسلام کا منتخب امام یا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔[3] عباسیوں کے عہد میں نظم و نسق کے بہت سے ترقی یافتہ

---

[1] ہنری نوس [illegible] ترجمہ اردو ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۱

[2] " " محولہ صدر صفحہ ۵۵، ۵۶

[3] امیر علی ہسٹری آف دی سارا سنز محولہ صدر صفحہ ([illegible])

ادارے قایم ہوئے[1]

عدل گستری کے سلسلے میں غیر مسلموں کے تمام دیوانی معاملات میں ان ہی کے مذہبی پیشواؤں یا اُن کے ہم مذہب حکام عدالت کو اختیار سماعت دیا گیا تھا[2] مسلمانوں کے دیوانی معاملات قاضیوں سے متعلق تھے چنانچہ ہر شہر میں قاضی[3] مقرر ہوتے اور ہر بڑے قصبے میں نائب قاضی بغداد کے جو خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں دارالحکومت بنا تھا۔ سب سے بڑے قاضی قاضی القضاۃ کہلاتے تھے اور یہی عدلیہ کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر تھے[4] اموی دور کی طرح قاضیوں کے محدود اور غیر محدود دونوں قسم کے اختیارات ہوتے تھے۔ قاضیوں کا تقرر یا تو خلیفہ کرتے تھے یا کبھی وزیر اور گورنر[5] قاضیوں کے فرائض اور اختیارات بھی کم و بیش وہی تھے جو اموی دور میں تھے۔ فوجداری یا تعزیری امور میں "صاحب المظالم" فصل خصومات کرتے تھے[6] اور فوجداری کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ "دیوان الناظر فی المظالم" تھی[7] اور یہی مجلس نظم و نسق اور محکمہ عدلیہ کی نگرانی بھی کرتی تھی[8] اس مجلس کی صدارت خود خلیفہ کرتے تھے یا خلیفہ کی غیر موجودگی میں کسی بڑے عہدہ دار حجاز کو صدارت کا اختیار تھا۔ اس مجلس کے دیگر ارکان میں قاضی القضاۃ۔ حاجب۔ مملکت کے بڑے معتمدین۔ اور بعض مفتی شامل تھے۔ اس

---

[1] امیر علی نحولہ صدر صفحہ (۴۰۸-۴۴۳)

[2] امیر علی ص (۴۲۱) -

[3] امیر علی۔ صفحہ (۴۲۲)۔

[4] امیر علی صفحہ (۴۲۲) -

[5] امیر علی صفحہ (۴۲۲) -

[6] قاضی کے تقرر کے لئے جو شرائط اور اصول مقرر تھے۔ ان کے مطالعہ کے لئے دیکھئے خدا بخش۔ ہسٹری آف اسلامک سیولائزیشن صفحہ (۲۸۴-۲۸۶) ماوردی احکام السلطانیہ۔ صفحہ (۱۱۷-۱۳۵) القضا فی الاسلام از عبدالسلام ندوی یا دیگر اہم فقہی کتب

[7] خدا بخش اورینٹ انڈر ڈی کیلیفس صفحہ ۲۸۴

مجلس کے فیصلوں سے کوئی فرد مملکت خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ روگردانی نہیں کرسکتا تھا[1] عدل گستری سے متعلق عام شکایتوں اور مرافعوں کی سماعت عباسی خلفا خود کرتے تھے اور اس سلسلے میں خاص طور پر مہدی، ہادی، ہارون اور مامون قابل ذکر ہیں اور مہدی آخری خلیفہ ہیں جنہوں نے اس طرز عمل کو جاری رکھا[2] اس کے بعد "صدر" کا ایک خاص عہدہ مقرر ہوا صدر "ناظر المظالم" کے اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا[3]۔ بعض وقت وزیر تفویض بھی اس کی صدارت کرتا[4] اور کبھی وزیر تنفیذ[5] یا والی[6] کو خلیفہ صدارت کے لئے نامزد کرتے تھے بہرحال اس صدر کا اعزاز قاضی سے زیادہ تھا۔ اور سچ پوچھئے تو تمام قاضی اس کے ماتحت سمجھے جاتے تھے[7] ماوردی کا خیال ہے کہ صدر محض قانون کی پابندی کے لئے مجبور نہ تھا۔ بلکہ وہ حقیقی انصاف کے لئے اصول عدل کو بھی کام میں لا سکتا تھا[8]۔ صدر عام طور پر عرضیاں وصول کرنے کے لئے ایک دن مقرر کرتا تھا[9] فریقین کی شہادت سنتا[10] اور خاص صورتوں میں یہ مشورہ دیتا تھا کہ مقدمات ثالث یا حکم کے پاس لے جائے جائیں[11] ان کے علاوہ صدر کے اور بھی فرائض تھے۔ مثلاً[12]

---

1. البیرعلی۔ صفحہ ۳۲۴
2. ماوردی ترجمہ جامعہ عثمانیہ بحوالہ صدر صـ ۱۳۸ خدا بخش اورینٹ انڈر دی کیلفس صفحہ (۲۸۸)
3. محمد عبداللہ صفحہ ۳۸
4. ماوردی بحوالہ صدر صفحہ (۴۹۔۵۱)
5. " " " (۵۷۔۵۹)
6. خدا بخش بحوالہ صدر صفحہ (۲۸۸)
7. ماوردی بحوالہ صدر صفحہ (۳۷۹) نیز ملاحظہ ہو باب فوجداری صفحہ (۱۳۶)
8. " صفحہ (۱۴۹-۱۵۳-۱۵۶-۱۶۱-۱۶۱-۱۶۷) نیز ملاحظہ ہو خدا بخش بحوالہ صدر صـ ۲۹۲
9. ایضاً " (۱۴۱)۔
10. ایضاً " (۱۴۷-۱۴۸)۔
11. محمد عبداللہ بحوالہ صدر صفحہ (۳۸)
12. ایضاً " " (۳۸)

Marfat.com

(۱) موقوفہ جائدادوں کی نگرانی اور انتظام۔

(۲) جن فیصلوں میں قاضی کو تعمیلی اختیارات نہ ہوں، ان فیصلوں کی تعمیل۔

(۳) امن عامہ کا قیام اور عبادت گاہوں اور نماز وغیرہ کا انتظام اور نگرانی۔

(۴) خزانہ شاہی۔ مالیہ اور خراج کے عہدہ داروں کی نگرانی۔

(۵) عاملہ کے عہدہ داروں کی نگرانی اور ان کی دست درازیوں کی چھان بین اور اس کا سدباب۔[1]

صدر جس عدالت میں اجلاس کرتا تھا وہاں مفتی اور قاضی بھی بیٹھتے تھے جو پیچیدہ قانونی مسائل میں صدر کو مشورہ دیتے۔ پورے عدالتی کاروبار کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے بعض عہدہ دار ہوتے۔ محافظ خانہ بھی ہوتا اور عدالت کی ہدایتوں اور احکام بروئے کار لانے کے لئے بھی ایک عملہ ہوتا۔[2]

۱۱۷۱ء میں نور الدین محمود نے جو ایک بڑے فقیہ اور محدث تھے۔ عدل گستری کے لئے ایک عدالت عالیہ قائم کی اور اس کا نام "دار العدل" رکھا اور تمام عدالتیں ایک جگہ قائم کیں[3] ان کے عہد میں عدلیہ کے نظم و نسق میں بڑی ترقی ہوئی۔

اسلامی دور عدلیہ کے بعض اہم امور

قاضی کے اختیارات | امام علاؤ الدین ابو الحسن علی بن خلیل الطرابلسی الحنفی قاضی بیت المقدس اپنی کتاب "معین الحکام" میں امام قرافی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قاضی کا کام صرف احکام کا نفاذ ہے۔ وہ ملک کے عام نظم و نسق میں دخل نہیں دیتا اور سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔[4]

استاد محمد بک خضری قاضی کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خلفائے راشدین کے عہد میں قاضی صرف شہری تنازعات کا تصفیہ کرتے تھے۔ قصاص اور حدود کے اجراء کا

---

[1] یعنی عاملہ کو عدلیہ کے ماتحت رکھا گیا تھا۔

[2] خدا بخش۔ ڈی اوریئنٹ انڈر دی کیلفس مجلس کے عہدہ داروں کے فرائض کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ (۲۹۰، ۲۹۱)۔

[3] امیر علی ہسٹری آف دی سارا سنز بحوالہ صدر۔ ص ۳۳۴

[4] دیکھئے سوتوس بحوالہ صدر ص ۱۲

کام خلفاء اور والی خود انجام دیتے تھے۔ قید اور جرمانہ جیسی تادیبی سزائیں بھی خلیفہ یا اس کا عامل دیتا تھا۔ اس طرح اس کا دائرہ اختیار اس زمانے میں محدود تھا۔[1]

مقدمہ ابن خلدون میں ہے کہ خلفاء کے عہد میں قاضیوں کا کام یہ تھا کہ تنازعات کا تصفیہ کریں۔ بعض اوقات اس کام کے علاوہ خلیفہ ایسے کام بھی قاضی کے سپرد کرتا تھا۔ جن کے متعلق اس کو اطمینان ہوتا کہ دوسروں کے مقابلہ میں قاضی بہتر طور پر انجام دے سکے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قاضی ابوادریس خولانی کو مظالم کی روک تھام اور مظلوموں کی دادرسی اور مجرموں کو سزا دینے کا کام سپرد کیا تھا۔ مامون الرشید نے قاضی یحییٰ بن اکثم اور معتصم نے قاضی احمد بن ابی داؤد کو بھی یہ امور تفویض کئے تھے۔[2]

عابس بن ربیعہ مرادی قاضی مصر اور یونس بن عطیہ حضرمی قضا کے محکمہ کے علاوہ شرطہ (پولیس) کے بھی ذمہ دار تھے۔ بعض قاضی لشکر کی قیادت بھی کرتے تھے۔ مامون الرشید نے یحییٰ بن اکثم کو اور اندلس میں عبدالرحمٰن الناصر نے قاضی منذر بن سعید کو عساکر کی قیادت بھی سپرد کی تھی۔[3]

بعض قاضی بطور خود اپنے اختیارات میں توسیع کر لیتے تھے۔ اور عام افادیت کی خاطر خلیفہ اس پر معترض نہ ہوتے۔ مثال کے طور پر عبدالرحمٰن بن معاویہ بن خدیج نے جو عبدالعزیز بن مروان کی طرف سے مصر کے قاضی تھے، یتیموں کے اموال کی نگرانی اپنے ذمہ لی تھی۔ پولیس کا محکمہ بھی ان کے تحت تھا۔ اسی طرح ہشام بن عبدالملک کے عہد میں قاضی مصر توبہ بن نمر نے اوقاف کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ۱۱۸ھ میں توبہ قاضی ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اوقاف کی آمدنی پر متولیوں اور ان کے خاندان کا نہیں بلکہ غربا اور مساکین کا حق ہے۔[4]

---

١ دیکھئے عرنوس حوالہ صدر ص ٦١
٢ " " ص ٦٢
٣ " " ص ٦٣
٤ دیکھئے عرنوس ص ٦٤-٦٥

Marfat.com

ایوانِ عدالت عدالت میں قاضی کا حد درجہ ادب اور احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا اور قاضی کے سامنے امیر و غریب، حاکم اور عامی سب برابر تھے۔

فیصلوں کا ریکارڈ اور ان کی تعمیل خلافت راشدہ اور بنو امیہ کے زمانے میں شعبۂ قضا ابتدائی منزلوں میں تھا۔ فیصلوں کو تحریری شکل میں محفوظ رکھنے کا طریقہ غالباً رائج نہ تھا بعد میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریکارڈ محفوظ رکھا جانے لگا۔ محمدؐ بن یوسف کندی نے "تاریخ قضاۃ مصر" میں لکھا ہے کہ سلیم بن عتر جو معاویہ بن ابوسفیان کی طرف سے مصر کے قاضی تھے، ایک رجسٹر میں اپنے فیصلے لکھتے اور لشکر کے بعض سرداروں کی گواہی اس پر ثبت کراتے تھے[1]

فیصلوں کی تعمیل کرانے کا کام بھی قاضی کے سپرد تھا۔ لیکن عملی اقدام کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی[2]

فیصلوں میں تبدیلی فقہاء کا عام طور پر خیال ہے کہ جب قاضی ایک مرتبہ اپنا فیصلہ سنا دے تو اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ بعد میں کسی غلطی کا علم بھی ہو جائے تو قاضی فیصلہ میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ البتہ سابقہ نوعیت کا کوئی دوسرا مقدمہ پیش ہو اور قاضی حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے مختلف رائے رکھتا ہو تو دوسرا فیصلہ کرنے میں کوئی امر مانع نہیں[3]

عہدۂ قضاء کے لئے معیار قابلیت ابوعبداللہ محمدؐ بن فرج المالکی "اقضیۃ الرسول" میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، شافعی اور ابوحنیفہ تینوں کے خیال میں فصلِ خصومات کے لئے حاکم ایسا ہونا چاہیئے جو نہ صرف حدیث اور فقہ کا عالم ہو بلکہ عقل و خرد اور تقویٰ و پرہیزگاری کے اوصاف سے بھی آراستہ ہو۔ ان صفات کا کوئی شخص پورے طور پر حامل نہ ہو تو امام مالک کے خیال میں ایسے شخص کو مسند عدالت پر بٹھانا چاہیئے جو عالم اور متقی اور پرہیزگار ہو[4]

---

[1] قاضی سلیم تابعین کے طبقہ اولیٰ میں تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان کو مصر کا پہلا قاضی مقرر کیا تھا۔ بیس سال تک مصر کے قاضی رہے ۶۵ھ میں فوت ہوئے۔

[2] عزنوس ص ۶۷

[3] " ص ۶۸، ۶۹

[4] " ص ۱۵۳

"بدایتہ المجتہد" میں ابو الولید محمدؐ بن احمد بن رشد القرطبی حسب ذیل شرائط قاضی کے لئے ضروری بتاتے ہیں۔

" وہ آزاد ہو۔ مسلمان ہو۔ عاقل اور بالغ ہو۔ عادل ہو۔ بعد تقرر اس کی حرکات تقوی اور دیانت کے خلاف اور فسق و فجور پر دلالت کریں تو معزول کر دینا چاہیئے۔ تاہم اس کے سابقہ فیصلے برقرار رہیں گے۔

"تبصرۃ الحکام" میں قاضی کے لئے دس شرائط بتائی گئی ہیں :۔

(۱) مسلمان ہو (۲) عقل و خرد (۳) مرد (۴) آزاد (۵) بالغ (۶) عادل صادق القول، امین پاکباز، پرہیزگار، شبہات سے محفوظ، خوشی ناخوشی کی حالت میں یکساں قابل اعتماد ہو (۷) عالم ہو۔ (۸، ۹، ۱۰) قوت سامعہ، بینائی اور گویائی میں فرق نہ ہو۔[1]

امام ابو الحسن علی بن محمدؐ بن حبیب البصری البغدادی الماوردی" احکام السلطانیہ" میں قاضی کے لئے سات شرطیں ضروری بتاتے ہیں :۔

(۱) مرد ہو اور بالغ ہو۔ (۲) اتنی عقل جس پر شرعی تکلیف کا مدار ہے، یعنی معلومات کے ساتھ ہوشیاری، ذکاوت طبع بھی رکھتا ہو۔ اور غفلت سے محفوظ ہو۔ (۳) غلام نہ ہو (۴) مسلمان ہو (۵) عدالت۔ یعنی صادق القول، امین، پاکدامن، پرہیزگار، شبہات سے محفوظ، خوشنودی و خفگی میں یکساں قابل اطمینان ہو (۶) قوت سامعہ اور باصرہ کی سلامتی۔ اور رعب داب کے لئے مناسب یہ ہے کہ صحیح الاعضاء، توانا اور تندرست ہو۔ (۷) علوم شرعیہ کے اصول سے واقف ہو اور فروع میں اعلیٰ مہارت رکھتا ہو۔ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول صلعم نیز مسائل اجماع سے پوری طرح واقف ہو اور مختلف فیہ مسائل میں اجتہاد کر سکتا ہو۔ قیاس سے واقف ہو۔[2]

جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے، فقہا میں اختلاف رائے ہے۔ امام شافعیؒ کی رائے میں قاضی کے لئے مجتہد ہونا ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مجبوری کی صورت میں کسی عام آدمی کو بھی قاضی بنایا جا سکتا ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد کے خیال میں عورت کو قضاء کا عہدہ نہیں دیا جا

---

[1] عزوس ص ۱۵۴

[2] ماوردی احکام السلطانیہ اردو ص ۱۱۸/۱۱۹

سکتا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جن معاملات میں عورت کی گواہی قابل قبول ہے، ان میں عورت کو قاضی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ ابن جریر الطبری کی رائے ہے کہ عورت کو تمام معاملات میں قاضی مقرر کیا جا سکتا ہے[1]

قاضی القضاۃ یہ اصطلاح خلفاء راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں نہیں ملتی۔ بنو عباس کے زمانے میں پہلی مرتبہ یہ عہدہ قائم ہوا۔ چنانچہ اسی زمانے میں احکام فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے اختیارات اور فرائض کے ساتھ ساتھ قاضی القضاۃ کے اختیارات و فرائض کے تذکرے ملتے ہیں۔ اس کی حیثیت موجودہ زمانے کے چیف جسٹس کی تھی۔ مملکت کے مختلف حصوں میں قاضیوں کے تقرر و تنزل وغیرہ کے اختیارات اس کو حاصل تھے۔ دار الخلافہ بغداد میں مملکت اسلامیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف تھے۔ ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید نے ان کا تقرر کیا تھا اور ۱۸۳ھ تک جبکہ ان کی وفات ہوئی یہ اس عہدے پر فائز رہے۔

قاضی القضاۃ کا عہدہ عباسیوں کے عہد میں عہدۂ وزارت کے برابر تھا اور بعض کو ساتھ ہی وزیر بنا دیا جاتا تھا[2]

بعض مشہور قاضیوں کے عہد کی نظیریں قاضی شریح بن حارث کندی کو حضرت عمرؓ نے کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی یہ قاضی رہے۔ شعبی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ وہ قاضی شریح کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف شکایت لے کر ان کی عدالت میں آئی۔ بیان دیتے ہوئے زار و قطار روتی تھی۔ شعبی اس سے متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے قاضی شریح سے کہا: "اے ابو امیہ! اس عورت کے رونے چلانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مظلوم اور بے کس ہے۔ اس کی ضرور داد رسی کرنی چاہیئے"۔ شریح نے جواب دیا: "اے شعبی! یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی ان کو کنوئیں میں ڈالنے کے بعد اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے تھے"[3]

---

[1] عرنوس صہ ۱۶۸-۱۶۹

[2] " " صہ ۱۸۸

[3] عرنوس صہ ۷۴، ۷۵

عامر بن شراحیل الشعبی ایک بہت بڑے عالم تھے۔ شریح کے بعد کوفہ کے قاضی بنے۔ ایک مرتبہ ان کی عدالت میں ایک میاں بیوی کسی نزاع کے تصفیہ کے لئے آئے۔ عورت بہت حسین تھی۔ پہلے اسی نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ بڑی فصاحت اور بلاغت سے اپنے حق میں دلیلیں پیش کیں۔ جب وہ بحث ختم کر چکی تو شعبی نے اس کے شوہر سے کہا "تمہارے پاس بھی کوئی ایسا شخص ہے جو اس بے نظیر فصاحت و بلاغت اور خوش اسلوبی سے تمہارا دفاع کر سکے؟" اس شخص نے فی البدیہہ اشعار پڑھے، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

شعبی نے میری بیوی کی طرف نظر اٹھائی تو وہ فتنہ میں پڑ گیا۔ اور اس کے ناز و ادا نے اسے مزید فتنہ میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے اردلی سے کہا کہ اس عورت کو میرے نزدیک لے آؤ۔ اس کے گواہوں کو حاضر کرو۔ اس نے بے انصافی سے کام لے کر مدعی کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ لیکن مدعی علیہ کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے خود شعبی نے لکھا ہے ایک مرتبہ میں امیر المومنین عبدالملک بن مروان کے پاس گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور کہا "فتن الشعبی لما رفع الطرف الیہا" اس کے بعد کہنے لگے کہ تم نے ان اشعار کے کہنے والے کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ میں نے جواب دیا "امیر المومنین! میں نے بحکم عدالت اور افترا پردازی کے جرم میں اس کو کوڑوں کی سزا دی۔ انہوں نے کہا: تم نے اچھا کیا۔"[1]

ابو واثلہ ایاس بن معاویہ بن قرہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں بصرے کے قاضی بنے۔ عبداللہ بن مصعب سے مروی ہے کہ ایاس کے والد معاویہ بن قرہ نے اپنے بیٹے کی عدالت میں ایک دعوی دائر کیا۔ دعوی یہ تھا کہ کسی شخص نے ان سے چار ہزار درہم قرض لئے تھے۔ پھر وہ منکر ہو گیا۔ تائید میں چار گواہ بھی پیش کر دیئے جنہوں نے قرض کی دستاویز پر دستخط کئے تھے۔ مدعی علیہ نے عدالت میں آکر ایاس سے کہا: اے ابو واثلہ، آپ میرے معاملہ میں انصاف کریں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے مدعی سے صرف دو ہزار درہم قرض لئے تھے، چار ہزار نہیں۔ یہ نہیں بتا سکتا کہ دستاویز پر چار ہزار درہم کیسے درج ہو گئے ہیں۔

لہ شذرات الذہب کے حوالے سے یونس ص ۸۰۔ شعبی ۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔

ایاس نے گواہوں سے دریافت کیا۔ تم نے جب اپنی گواہی ثبت کی تھی تو کیا عبارت میں درمیان سے کوئی جگہ خالی تھی، انہوں نے جواب دیا" جی ہاں۔ پہلے عام دستور کے مطابق کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی، اس کے بعد قرض کی رقم ایک سطر میں لکھی ہوئی تھی اور پھر وسط کی جگہ خالی چھوڑ کر آخر میں گواہیاں درج کرائی تھیں"۔

ایاس نے پوچھا" کیا مدعی تم لوگوں سے مل کر اس رقم کی یاد دہانی بھی کرتا رہا؟" کہا "جی ہاں! یہ اکثر کہا کرتا تھا کہ یاد رکھو مجھے فلاں شخص سے چار ہزار درہم وصول کرنے ہیں"۔

قاضی نے اپنے والد سے کہا" آپ نے ان نیک اور سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیا۔ قرضہ کی رقم کاغذ کے درمیانی حصہ کے قریب علیحدہ سطر میں لکھی اور پھر جگہ چھوڑ کر گواہیاں ثبت کرائیں۔ بعد میں آپ نے اس سطر کو کاغذ سے علیحدہ کر کے خالی جگہ پر چار ہزار درہم کا اندراج کر دیا اور کاغذ کو اس طرح جوڑ دیا۔ جیسے پرانے اور بوسیدہ کاغذوں کو درمیان سے جوڑا جاتا ہے۔ معاویہ نے اقرار کیا کہ واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

قاضی ایاس کے اجلاس میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک شخص نے اپنا کچھ مال اپنے کسی واقف کار کے پاس رکھوایا تھا اور جب واپس مانگا تو دوسرے شخص نے انکار کر دیا۔ قاضی نے مدعی سے پوچھا" تم نے اپنا مال اس شخص کو کس جگہ حوالہ کیا تھا؟" اس نے جواب دیا کہ ایک میدان میں دیا تھا، جہاں ایک درخت بھی تھا۔ ایاس نے کہا:" یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنا مال وہیں کسی جگہ دفن کر دیا ہو اور بعد میں وہ جگہ بھول گئے ہو جاؤ اور زمین کھود کر مال تلاش کرو"۔ مدعی تلملایا لیکن قاضی کے حکم پر مجبوراً جانا پڑا۔ مدعی علیہ کو ایاس نے عدالت ہی میں بٹھا رکھا اور خود دوسرے مقدموں کی سماعت میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے مدعی علیہ سے پوچھا:" وہ شخص اس درخت تک پہنچ گیا ہو گا؟" اس نے کہا" ابھی نہیں پہنچا ہو گا"۔ اس پر ایاس نے کہا" اے اللہ کے دشمن! تو نے یقیناً اس شخص سے مال حاصل کیا۔ ورنہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ابھی درخت تک مدعی نہیں پہنچا ہو گا۔ فوراً اس کا مال واپس کر دے"۔ چنانچہ انہوں نے آدمی بھیج کر مدعی کو بلوایا اور کہا کہ اس شخص کو ساتھ لے جاؤ اور اپنا مال واپس لے لو۔

لہ ابن قیم اور ابن خلکان کے حوالے سے عرنوس محولہ صدر ص ۸۵-۸۶
قاضی ایاس کی وفات ۱۲۳ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں ہوئی۔

Marfat.com

سلطنت دہلی اور اس کا نظام عدل گستری

مسلمان ہندوستان میں

ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کا سیاسی تعلق اس وقت سے شروع ہوا جب کہ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا (۷۱۱ء - ۷۱۲ء)۔ سندھ ایک عرصے تک اموی اور عباسی خلافت کا ایک مشرقی صوبہ بنا رہا۔ سندھ کی مقامی حکومت کی تشکیل خلافت کے دوسرے حصّوں کی طرح تھی۔ اندرونی نظم و نسق کے تمام امور والیِ وقت کے اختیار پر موقوف تھے۔ فاتح سندھ نے خاص طور پر مذہبی رواداری پر بہت زور دیا۔ علمائے دمشق سے یہ فتویٰ حاصل کیا گیا کہ ہندوستان میں ہندو مندروں کی وہی حیثیت ہوگی جو خلافت کے دیگر صوبوں میں عیسائی کلیساؤں یا یہودی معبدوں کو حاصل ہے۔ برہمنوں کو وہ تمام حقوق عطا کئے گئے جو ہندو راجاؤں کے زمانہ میں حاصل تھے۔ بلکہ انہیں وصول مالگزاری کے لئے عہدے بھی دیئے[2] اور خود راجہ داہر کے وزیر کو اس کے قدیم عہدے پر بحال رکھا گیا[3] نیز جو برہمنوں کو راجہ داہر کے زمانے میں نظم و نسق میں ذمہ دار عہدے حاصل تھے،

---

[1] فتح سندھ سے قبل بھی حضرت عمر کے دور میں مسلمان ہندوستان میں آئے لیکن اس کا تذکرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے کیوں کہ اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سندھ کا نظم و نسق رسالہ اسلامک کلچر (۱۹۴۳ء) ص ۱۱۹۔

[2] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایڈمنسٹریشن آف سلطنت آف دہلی۔ لاہور ۱۹۴۲ء۔ ص ۳

[3] الفنسٹن: ہسٹری آف انڈیا (لندن ۱۹۱۶) ص ۳۰۳۔ ۳۱۱۔

وہ بحال رہے[1]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا نظم ونسق خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہا جس میں فاتح کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے[2]۔ فصل خصومات میں شاستر پر عمل کیا جاتا تھا[3]۔ ہندوؤں کے مقدمات ہندو قانون کے مطابق طے پاتے اور ——————

——— شرعی مداخلت نہیں کی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ خود رسمی قانون بھی ان پر عاید نہیں ہوا[4]۔ دیوانی مقدموں میں ہندوؤں کی قدیم پنچایتیں ہی فیصلے کرتی تھیں[5]۔ اب رہے مسلمان جو زیادہ تر سپاہی تھے تو ان کے لئے قاضی مقرر تھے اور قاضی مفتی کے مشورے سے شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتے تھے[6]۔ البتہ عام اور سیاسی جرائم کی صورت میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں تھا۔ قاضیوں اور مفتیوں کے فیصلوں کا مرافعہ گورنر کی عدالت میں ہوتا تھا۔[7]

محمد بن قاسم نے سندھ میں نظم ونسق کی جو نظیر قایم کی تھی، اس کی بعد کے مسلمان فاتحوں نے پیروی کی[8]۔

پنجاب کی حکومت

فتح سندھ کے تقریباً تین صدی بعد غزنویوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قایم کی لیکن بدقسمتی سے مورخین اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی معلومات سے ہم بے بہرہ ہیں۔ خود بیہقی کی "تاریخ آل سبکتگین" کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اسی لئے اس زمانے کے تفصیلی حالات معلوم کرنے میں

---

[1] محمد اللہ ص ۵۷

[2] الفنسٹن محولہ صدر ص ۳۰۲۔ ص ۳۰۳

[3] واحد حسین ایڈمنسٹریشن ڈیورنگ مسلم رول ان انڈیا۔ کلکتہ۔ ۱۹۳۴ء ص ۵۷۔

[4] واحد حسین محولہ صدر ص ۱۸

[5] ایشوری پرشاد: ہسٹری آف میڈیول انڈیا (الہ آباد۔ ۱۹۲۵) ص ۴۶-۴۷

[6] محمد اللہ۔ ایڈمنسٹریشن آف جسٹس آف مسلم لا۔ الہ آباد۔ ۱۹۲۶ء ص ۵۷

[7] واحد حسین محولہ صدر ص ۱۸۔

[8] قریشی محولہ صدر ص ۱۳۔

Marfat.com

بڑی دقت ہوتی ہے[1]۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سلاطین دہلی نے آل سبکتگین کی دو سو سالہ حکمرانی کے تجربوں سے ضرور فائدہ اٹھایا[2] اور خود غزنویوں نے سندھ سے خوشہ چینی کی ہے[3]۔

غزنوی دراصل سامانیوں کے خوشہ چین تھے۔ ابتدائی دور میں خود محمود نے اپنے سکوں پر اپنے کو سامانی گورنر ظاہر کیا ہے[4]۔ البتہ ۹۹۹ عیسوی سے محمود غزنوی نے "امیر" کا لقب اختیار کر لیا[5] اور سامانیوں کا نام سکوں سے خارج کر دیا[6] اور براہ راست خلیفہ بغداد سے اپنے آزاد سلطان ہونے کی سند منگوالی[7]۔

لاہور ہندوستان میں شاہان غزنی کا مرکز تھا یہاں ان حکمرانوں نے حکومت اور نظم و نسق کا جو نقشہ مرتب کیا، وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اول یہ کہ ان لوگوں نے سندھ کے سیاسی تجربوں سے فائدہ اٹھایا۔ اور مذہبی رواداری میں جو ہندو رعایا کے ساتھ ہوتی تھی، غزنویوں نے سندھ کے عرب فاتحوں کی پیروی کی اور ہندو عہدہ دار مقرر کئے[8] دوسرے یہ کہ غزنویوں نے عباسی اداروں سے بھی استفادہ کیا۔ یہ ادارے غزنی اور لاہور لائے گئے۔ یہ ادارے بہت کام آئے اور سلطنت دہلی کے لئے ان کے کئی نقوش باقی رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ غزنی اور دہلی کے

---

[1] اس دور سے متعلق ہم عصر ادبیات کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ:۔
ان ڈسکورڈ سورس بکس آف پری مغل ہسٹری از ڈاکٹر اے بی ایم حبیب اللہ ــــ پروسیڈنگز انڈین ہسٹری کانگریس (تیرا اجلاس کلکتہ) صہ ۸۰۰

[2] قریشی صہ ۳۔

[3] قریشی صہ ۳-۴۔

[4] ایڈورڈ تھامس، کائنز آف دی کنگز آف غزنی (لندن ۱۸۴۸ء) صہ ۲

[5] تری پتی صہ ۹

[6] تھامس محولہ بالا صہ ۲

[7] تری پتی صہ ۹۔

[8] قریشی صہ ۴۔

Marfat.com

بہت سے ادارے ایک دوسرے کے مشابہ بلکہ مشترک معلوم ہوتے ہیں[1]

اس دور کے نظام عدل گستری کے متعلق ہمارے پاس کوئی مواد نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غزنویوں نے سندھ کی عرب حکومت کی طرح دیوانی معاملات میں خود ہندوؤں کی پنچایتوں سے کام لیا اور ہندو پنڈتوں کو فصل خصومات کا اختیار دیا۔ اور مسلمانوں کے معاملات قاضیوں سے متعلق رہے۔ البتہ عام اور سیاسی جرائم میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں تھا۔ عدل گستری کے دوسرے معاملات میں غزنویوں نے عباسیوں کی کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ پیروی کی۔ اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان غیر عربی اداروں میں جن کو غزنویوں نے بغداد سے لیا۔ ایک عہدۂ وزارت بھی تھا[2] جسے ایران قدیم کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ سامانی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد محمود نے سلطنت غزنی میں اس طرح وزیر مقرر کئے۔ ابو العباس فضل بن احمد اس کا پہلا وزیر ہوا[3] جو سلطان کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ محمود غزنوی شرع کا بہت پابند اور بڑا عادل تھا[4]

سلطنت دہلی

شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں دہلی پر قبضہ کیا، لیکن سلطنت دہلی کی ابتدا ۱۲۰۶ء سے ہوئی۔ جبکہ شہاب الدین کا انتقال ہو گیا اور قطب الدین ایبک[6] ہندوستان میں خود مختار بادشاہ بن گیا۔ لیکن آور اس کے بعد کے ابتدائی ترک سلاطین کو ہم عموماً مورخ قطبی، شمسی اور بلبنی سلاطین کے نام سے یاد کرتے ہیں[5] یہ دراصل ترک غلام تھے۔ لیکن مسند سلطنت پر بیٹھنے

---

[1] قریشی ص ۳

[2] محمد اللہ ص ۵۷

[3] ترمی پتی ص ۱۶۱

[4] " " ص ۱۶۵

[5] ملاحظہ ہو سر ونیس راس تاریخ فخر الدین مبارک شاہ لندن ۱۹۲۷ء۔ ص ۵۲-۵۳

[6] معز الدین کے غزنی کے راستے میں قتل ہونے کے بعد قطب الدین ایبک کی ہندوستان میں خود مختاری اور اس وقت دہلی اور لاہور کی کیفیت کا دلچسپ تذکرہ ملاحظہ ہو۔ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ محولہ صدر ص ۳۰-۳۲

[7] منہاج ص (۱۳۵-۱۳۷-۱۶۴)

سے پہلے آزاد ہو چکے تھے۔ ایبک نے سلطان محمد غوری سے خط آزادی حاصل کر لیا تھا[۱] شمس الدین التمش نے اپنے آقا سے آزادی حاصل کی تھی[۲] التمش کے بعد اس کے بیٹے تخت نشین ہوئے تھے، جو کامیاب نہیں ہوئے۔ پھر بلبن جو التمش کے غلامان "چہل گانہ" میں شامل تھا، تخت دہلی پر بیٹھا۔ یہ بھی آزاد ہو گیا تھا[۳] یہ قطبی اور شمسی سلاطین جو دلی پر ۱۲۹۰ء تک حکمران رہے، سب کے سب ترک تھے۔ اور التمش اور بلبن تو ترکستان کے البری قبیلے کے ارکان تھے[۴]

تیرھویں صدی عیسوی کی یہ ترک حکومت مختلف عناصر پر مشتمل تھی۔ جن میں سے کچھ تو بدیسی تھے اور کچھ ہندوستانی۔ بادشاہ اور اس کے اہل حاشیہ ایرانی تزک و احتشام کے دلدادہ تھے[۵] فوجوں کی تنظیم منگولی اور ترکی طرز کی تھی[۶] اور جہاں تک حکومت کی تنظیم کا تعلق تھا: مرکزی حکومت تو ترکی اور عباسی شان رکھتی تھی۔ لیکن مقامی حکومت کا قدیم ہندوستانی نظام برقرار رہا۔ قرائن یہی ہیں کہ قطب الدین ایبک نے لاہور کے موجود الوقت اداروں کی خوشہ چینی کی اور غزنویوں کے بہت سے عہدہ داروں سے کام لیا[۷] شمس الدین التمش کے دربار میں بغداد کی مشہور شخصیت یعنی فخر الدین عصامی موجود تھے۔ جو خلافت میں تیس سال تک وزیر رہ چکے تھے۔ سلطان نے انہیں اپنا وزیر اعظم بنایا تھا[۸] نیز بہت سی ایسی شخصیتیں بھی تھیں۔ جو

---

۱ منہاج سراج طبقات ناصری (فارسی)۔ کلکتہ ۱۸۶۴ء، ص ۱۴۰

۲ منہاج ص ۱۴۰

۳ برنی تاریخ فیروز شاہی کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۲۵-۲۶

۴ منہاج ص ۱۶۶ (۲۸۱)۔

۵ برنی ص ۲۸-۲۹

۶ ڈاکٹر عزیز احمد

۷ قریشی ص ۴۲

۸ فرشتہ — جلد ا نولکشور کانپور ۱۸۷۴ء ص ۱۱۷ عصامی فتوح السلاطین مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین آگرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۲۲

Marfat.com

منگولوں کے ڈر سے ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی تھیں[1]۔ اس طرح ابتدائی بیس سال کے اندر ہی سلطنت دہلی میں نظم و نسق کے بہترین ماہر جمع ہو گئے[2] شروع ہی سے ان ترک سلاطین کو نظم و نسق کا اچھا ذوق تھا اور وہ گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک کے عہد میں فخر مدبر نے "آداب الملوک" لکھی جس میں تنظیم حکومت کے تمام اصول جمع کئے گئے ہیں۔

التمش کے انتقال کے بعد مرکزی اقتدار کمزور ہو گیا۔ اور غلامان "چہل گانہ" زور پکڑنے لگے۔ لیکن بلبن کی بدولت مرکز میں پھر جان آ گئی۔ بلبن نے ایرانی انداز میں اپنا شاہی اقتدار قایم کیا[3] اس کے دربار میں جو لوگ تھے، اُن میں اکثر باہر سے آئے تھے۔ اُن میں بغداد کے شاہی خاندان کے افراد، عالم، فن کار، مدبر و سیاست کار غرض سب طرح کے لوگ شامل تھے[4] یہ سب غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے اور ان کے جمع ہونے سے شہر دہلی اسلامی دنیا میں بہت مشہور ہو گیا[5] بلبن کی ساری توجہ یا تو مدافعتی تدابیر میں صرف ہوئی یا نظم و نسق کی اصلاحوں میں۔ بلبن نے شروع کی بہت پابندی کی۔ اس کی شاہی جمہور کے سامنے ذمہ دار نہیں تھی۔ مگر وہ اسے خدا کے سامنے ذمہ دار ضرور سمجھتا تھا۔[6]

شمسی حکمرانوں کے بعد ۱۲۹۰ء میں خلجی خاندان برسر اقتدار آیا۔ جلال الدین خلجی بہت نرم دل واقع ہوا تھا، اس لئے کسی بڑی اصلاح کی جانب اس نے قدم نہیں اٹھایا۔ البتہ اس کا جانشین علاء الدین بہت حوصلہ مند ثابت ہوا۔ اس نے نظم و نسق کے بڑے کامیاب تجربے کئے[7] لیکن علائی حکومت کی بنیاد وہ نہ تھی، جو التمش اور بلبن کی تھی بلکہ اس نے

---

[1] فرشتہ جلد ۱ صہ ۱۳۱-۱۳۲

[2] قریشی صہ ۴

[3] برنی تاریخ فیروز شاہی کلکتہ ۱۸۶۲ء صہ ۲۶ تا ۲۹-۳۰ تا ۳۲)

[4] تھامس۔ کائنز آف دی کنگز آف غزنی۔ لندن ۱۸۴۸ء صہ ۲۵۴-۲۵۵-

برنی صہ ۲۷-۱۱۱-

[5] برنی صہ ۱۱۱-۱۱۲

[6] ڈاکٹر ایشوری ٹوپا۔ اورکلچرل ہیری ٹیج۔ الہ آباد۔ صہ ۸۹۔

[7] قریشی صہ ۵۔

نظم ونسق میں علما کو مداخلت کا موقع نہیں دیا[1] اور اس کا دنیاوی قانون سلطان کی مرضی کے تابع تھا[2] ۱۳۲۱ء میں تغلق خاندان تخت دہلی پر برسر اقتدار آیا۔ غیاث الدین نے نظم ونسق میں بہت سی اصلاحیں کیں[3] یہ بڑی اچھی سیاسی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کے زمانے میں سلطنت دہلی کا نظم ونسق بڑا اچھا رہا۔ سلطان محمد بن تغلق نے جب تک اس نظم ونسق میں دخل نہیں دیا، سلطنت دہلی برابر عروج پر رہی۔ لیکن جب اس نے اپنے سیاسی تجربے شروع کر دیئے تو پھر مرکز میں کمزوری آنے لگی۔ محمد بن تغلق دراصل ایک بڑا عالم تھا[4] لیکن جہاں بانی سے عاری تھا۔ اس کے منصوبے نظری اعتبار سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تھے یہ اپنے زمانے سے بہت آگے۔ اس لئے سب منصوبے ناکام ہوئے اور ہندوستان کی سیاست کو نقصان پہنچا۔

ادارۂ شاہی

تیرھویں اور چودھویں صدی میں ان ترک خاندانوں نے ہندوستان میں جو شاہی قایم کی تھی، وہ قرونِ وسطیٰ کا ایک دلچسپ ادارہ ہے۔ اُسے "ترک شاہی" کہنا چاہیئے۔ ایبک کے عہد میں اس ادارے نے جنم لیا اور لودھیوں کے خاتمے تک کم وبیش تین سو سال قایم رہا۔ اس تین سو سال کے دوران میں اس میں مدوجزر بھی ہوئے۔ غور سے دیکھا جائے تو ترک شاہی میں ترکی ایرانی اور ہندوستانی عناصر شامل تھے۔ اس میں عربوں کے جمہوری تصورات کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا کیونکہ خلیفہ اسلام کا تو انتخاب ہوتا تھا اور مسلمان جمہور انتخاب کرتے تھے اور خلیفہ کا اقتدار جمہور کا دیا ہوا تھا[5] لیکن ترک شاہی میں قدیم ایرانی تصور ہے ایران کے ساسانی شہنشاہ اپنے حقوق کو آسمانی مانتے تھے اور حکمرانی کو اپنے خاندان کا خاص حق

---

[1] فرشتہ جلد ا ص ۱۰۹-۱۱۳

[2] ایشوری پرشاد ص ۲۰۶

[3] قریشی باب ۶ و باب ۱۰ نیز ملاحظہ ہو برنی ص ۴۲۹-۴۳۲

[4] نظام الدین احمد بخشی: طبقات اکبری لکھنو۔ ۱۸۷۵ء ص ۱۹۹-۲۰۰)۔

[5] ترپاٹھی ص ۲ ۔

Marfat.com

سمجھتے تھے۔ اسی طریقے سے ہندوستان کی ترک شاہی اسلامی تصور کے مطابق نہیں بلکہ قدیم ایرانی روایات کی تابع تھی[۱] سلاطین دہلی پر ایرانی و ترکی اثرات کے علاوہ ہندو تصورات کا بھی اثر پڑا[۲] چنانچہ اُن کے نظم و نسق اور خود نظام عدل گستری پر ہندوستان کے اثرات بھی پڑے[۳] اگر ترک شاہی پر اسلام کا جمہوری اثر ہوتا تو یہاں بھی دستوری شاہی قایم ہو جاتی لیکن ہندوستان کی یہ شاہی "رعایا پرور شخصی حکمرانی" سے آگے نہ بڑھ سکی۔[۴] کبھی تو سلطان کو دارالسلطنت کے عمایدا ور رہنما منتخب کرتے تھے اور کبھی طاقتور سلطان اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کو تخت کے لئے نامزد کر دیتا تھا[۵] چنانچہ التمش کے زمانے سے سلاطین نے اپنے بیٹوں کو نامزد کرنا شروع کیا[۶] اس کے جواز کے لیے ایک تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ امرا اور عمایدا اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تھے[۷] تخت نشینی کی رسم قاضی القضاۃ اور دیگر عہدہ داروں کے سامنے عمل میں آتی تھی[۸]

سلطان اور سلطنت کی حیثیت

قانوناً سلطنت دہلی مشرقی خلافت کا ایک جزو تھی۔ چنانچہ سلطان معزالدین کیقباد اپنے آپ کو ناصر امیرالمومنین لکھتے تھے[۹] قطب الدین ایبک[۱۰] اور بعد کے دیگر سلاطین بھی خود کو خلیفہ کا ماتحت سمجھتے تھے۔ بغداد میں عباسی سلسلہ خلافت ختم ہونے کے بعد بھی ہندوستان

---

۱ برنی ص۲۶ وغیرہ
۲ تری پتی ص۱۴۷
۳ بشیر احمد ص۶۲ - تری پتی ص۱۵۱
۴ تری پتی ص۱۵۱
۵ تری پتی ص۱۴۷
۶ ر ص۱۴۷
۷ ر ص۲۲ "بیعت" کا طریقہ خود بغداد میں بھی رائج تھا۔ ملاحظہ ہو امیر علی شارٹ ہسٹری آف دی سارا سنز لنڈن ۱۹۳۴ء ص۳۰۴-۵۰۴
۸ ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا۔ کلکتہ ۱۹۵۹ء ص۵۹۱ نیز ملاحظہ ہو ان ڈسکورڈ سورس بکس آف پری مغل ہسٹری از ڈاکٹر اے بی ایم حبیب اللہ — پروسیڈنگز انڈین ہسٹری کانگریس (تیسرا اجلاس کلکتہ ۱۹۳۹ء) ص ۸۰۰-۸
۹ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ محولہ صدر ص۱۹ ۔
۱۰ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ محولہ صدر ص۳۲ ۔

Marfat.com

میں خلیفہ کے اقتدار کو برتر سمجھنے کا تخیل برابر جاری رہا - عام طور پر سلاطین اپنے کو "دارالاسلام" سے وابستہ سمجھتے تھے - تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور خلیفہ عباسی مستعصم کے قتل کے بعد بھی سکوں اور خطبوں میں مستعصم کا نام موجود ہوتا تھا اور جلال الدین خلجی کے انتقال تک مستعصم کا نام دہلی کے سکوں پر نظر آتا ہے[1] - خود علاؤالدین خلجی نے اپنے لئے "ناصر امیر المومنین اور یمین الخلیفہ" کا لقب اختیار کیا[2] - سلاطین دہلی میں ایک آدھ مثال قطب الدین مبارک شاہ کی ایسی بھی ملتی ہے، جس نے خود خلافت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن محمد بن تغلق نے مصر کی خلافت سے رشتہ جوڑا اور اپنے سکوں پر خلفائے راشدین کے نام کندہ کرائے[3] - اس کے بعد دیگر سلاطین نے بھی یہ روایت جاری رکھی اور وہ کسی نہ کسی خلیفہ کی سیادت مانتے رہے، خواہ وہ گمنام ہی کیوں نہ ہوں - یہ تو سلطنت دہلی کی قانونی[4] حیثیت تھی - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک آزاد اور خود مختار سلطنت تھی[5] جس کا طریقہ حکومت شخصی حکمرانی تھا[6] - سلطان مملکت کا صدر تھا - اور فوجی سپہ سالار بھی - سلطان اصولاً شرع اسلام کے تابع تھا اور شرع کی تعمیل کروانا اس کا فرض تھا - اس کو قانون کے اصول میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہ تھا، البتہ سلطان کو تعبیر و توضیح قانون کے اختیارات تھے - اور بقیہ امور میں وہ پوری طرح خود مختار تھا - بادشاہ کی ذات نظم و نسق کا محور تھی اور اس کا دربار پوری سلطنت کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کا مرکز - البتہ کم سن یا نااہل بادشاہ کی صورت میں "ملک نائب" سلطان کے فرائض انجام دیتا تھا - سلطان وزیر کے مشورے سے کام کرتا تھا[7]

---

[1] تھامس محولہ صدر ص ۱۴۵

[2] تھامس محولہ صدر ص ۱۶۸-۱۷۳

[3] تھامس محولہ صدر ص ۲۱۶-۲۴۹، نیز ملاحظہ ہو نظام الدین احمد بخشی - طبقات اکبری ص ۲۰۰-۲۱۱ تا ۲۱۳ -

[4] قانونی اقتدار اعلیٰ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی باب ۲ -

[5] "واقعی مقتدر" کی حیثیت کے لئے ملاحظہ ہو قریشی باب ۳ -

[6] DESPOTISM

[7] بشیر احمد ص ۱۰۲ -

عام نظم ونسق

مرکزی حکومت کی تشکیل عباسی حکومت کے نمونے پر تھی[1] دیوان مظالم، احتساب اور مختلف درجے کی عدالتیں قایم کی گیئں[2] اور عدالتوں کے اختیارات اور فرائض متعین ہوئے[3] نظم ونسق کا سب سے بڑا عہدہ دار وزیر ہوتا تھا[4] جس کا خاص کام زیادہ تر مالیات کی تنظیم اور مالی محکمہ کی نگرانی تھا۔ اور بعض دفعہ وزیر کو محکمۂ عدل کے اختیارات بھی دے دیے جاتے تھے[5] وزیر کی مدد کے لئے نائب وزیر[6] مشرف ممالک[7] اور مستوفی ممالک[8] مقرر ہوتے تھے۔ ناظر اور وقوف بھی دو عہدہ دار تھے جو علی الترتیب وصول مالگزاری اور خرچ کی نگہداشت کرتے تھے[9] قاضی ممالک محکمہ عدلیہ کا چیف جسٹس[10] تھا، جو شرع کی پابندی کرواتا تھا۔ قاضی ممالک فصل خصومات کے علاوہ صدر الصدور کا بھی کام کرتا تھا[11] اس لحاظ سے تعلیم، امور مذہبی اور مساجد وغیرہ کے فرائض بھی اس کے سپرد تھے۔ فوج کا نظم ونسق "عارض ممالک" سے متعلق تھا[12]

---

[1] سرن پی: دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز، الہ آباد ۱۹۴۱ء صہ ۳۴ سلطان قطب الدین ایبک کے ابتدائی انتظام مملکت اور نظم ونسق کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فخر الدین مبارک شاہ محولہ صدر صہ ۳۲-۳۷

[2] بشیر احمد صہ ۱۰۰-۱۰۱ ۔

[3] بشیر احمد صہ ۱۰۱ ۔

[4] دلی کے عہدہ وزارت کا بغداد - غزنی وغیرہ کے عہدہ وزارت سے تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ تری پتی صہ ۱۶۱ تا ۱۶۷ - ۱۷۱ تا ۲۱۶ - نیز ملاحظہ ہو برنی صہ ۵۷۹ - قریشی صہ ۷۶-۸۲)

[5] بشیر احمد صہ ۱۰۲

[6] یہ نیا عہدہ تھا جو پہلی دفعہ دلی میں قایم کیا گیا - صہ ۲۱۶ تری پتی قریشی صہ ۸۲ ۔

[7] قریشی صہ ۸۲

[8] " صہ ۸۲

[9] "

[10] " صہ ۱۴۹

[11] " صہ ۸۳-۱۴۹

[12] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی صہ ۱۳۰-۱۴۸ ۔

اور بریدِ ممالک[۱] ڈاک اور خبر رسانی کا عہدہ دار تھا۔ امیر داد[۲] قاضیوں کے فیصلوں کی تعمیل کرواتا تھا۔ اور ملزمین اور مجرموں کو قاضی کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جب بادشاہ مرکز میں نہ ہوتے تو بھی امیر داد عدالت مظالم میں مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کوتوال پولیس کا عہدہ دار تھا۔ اور محتسب ملک کے اخلاق عامہ کی نگہداشت کے لئے مامور تھا۔ اشیاء کے نرخ اور منڈیوں کی نگرانی بھی محتسب کے سپرد تھی۔ چونکہ محتسب۔ کوتوال اور امیر داد کے فرائض ملے جلے ہوتے تھے۔ اس لئے یہ باہم تعاون کرتے تھے۔

یہ تو مرکزی حکومت کا نقشہ تھا۔ صوبہ داری حکومت کی تشکیل بھی ویسی ہی تھی۔ جیسی مرکزی حکومت کی البتہ اس کا پیمانہ چھوٹا تھا۔ صوبوں میں گورنر یا ناظم سلطان کی نمائندگی کرتے تھے[۳] اور پورے صوبہ داری نظم ونسق کے تمام تر ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح صوبوں میں اور محکمے بھی تھے، جو مرکز کے تابع تھے۔ مثلاً مالگزاری کا انتظام دیوان کے سپرد تھا اور اس کے ماتحت افسر "سرکار" میں عامل کہلاتے تھے[۴] گاؤں کے نظم ونسق کو پہلی اکائی سمجھا جاتا تھا۔ جہاں مکھیا اور محاسب متعین تھے۔ دیہات کی پنچایتوں سے بھی کام لیا جاتا تھا[۵] چند دیہات کو ملا کر "پرگنے" بنائے جاتے تھے اور پھر پرگنوں کے مجموعے "شق" کہلاتے تھے۔ یہی شق اور بعض چھوٹے صوبے بعد میں چل کر "سرکار" کہلانے لگے۔ گورنر تحفظ امن عامہ کے ذمہ دار تھے اور "فوجدار" سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ فوجدار ہر شق (ضلع) میں پولیس اور عاملہ کے فرائض انجام دیتے تھے[۶] پرگنوں میں پولس کا عہدہ دار "شقدار" کہلاتا تھا[۷] اس نظم ونسق کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہندو راجے اور امرا بھی اس میں شریک کئے گئے۔ مقامی نظم ونسق کے اکثر امور ہندوؤں

---

۱ قریشی ص ۸۶ ۔

۲ 〃 ص ۱۵۳ ۔

۳ بشیر احمد ص ۱۰۲ ۔

۴ 〃 〃 ص ۱۰۲-۱۰۳ ۔

۵ 〃 〃 ص ۶۲-۶۳-۱۰۱-۱۰۲ ۔

۶ 〃 〃 ص ۱۰۳ ۔

۷ 〃 〃 ص ۱۰۳ ۔

کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے۔ مملکت موجود الوقت مقامی اداروں کو مناسب اصلاحوں کے ساتھ جاری رکھتی تھی۔ قیام امن کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ اہم مقامات پر چھاؤنیاں بنادی گئیں جن میں مسلمان سپاہیوں کو آباد کیا گیا۔ اس کے علاوہ ذرائع آمدورفت میں بھی وسعت پیدا کی گئی۔

یہ مرکزی اور مقامی حکومت کا وہ مختصر سا خاکہ ہے جو قطبیوں، خلجیوں اور پھر تغلقوں کے زمانے میں تقریباً یکساں طور پر موجود تھا۔ اب ذرا تفصیل کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ سلاطین دہلی کا تصور عدل کیا تھا۔ اور انہوں نے شرع اسلام کی کہاں تک پابندی کی۔

سلاطین دہلی کا تصور عدل اور شرع اسلام

مسلمانوں کا ابتدا ہی سے یہ تصور رہا ہے کہ خدا کے احکام کی پابندی کرد ائیں اور ان کی خلاف ورزی نہ ہونے دیں یہ پوری مسلم جماعت کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اور عملی اغراض کی خاطر یہ فرض حکمران وقت کو سپرد تھا۔ اسی فرض میں عدل گستری بھی شامل ہے۔ خلیفہ عوام کے منتخب نمائندے کی حیثیت سے یہ فرض بذات خود انجام دیتا یا اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا۔ ان عہدہ داروں کے سامنے یہ قرآنی حکم تھا کہ "ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون"[1]۔ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی عدالتی عہدہ داروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید تھی اور قاضیوں کو خلاف شرع فیصلہ کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی[2]۔

سلاطین دہلی عام طور پر شرع کی سختی سے پابندی کرتے تھے[3] چنانچہ قطب الدین ایبک جو سلطنت دہلی کا بانی ہے، اس کے بارے میں خاص طور پر مشہور ہے[4] اور بقول برگس، اس کی حکومت میں بہترین قوانین نافذ تھے[5] قطب الدین ایبک قاضی فخر الدین کوفی جیسے متبحر عالم کا شاگرد تھا[6]۔ اور شرع کا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد اسلامی ندوی القضاء فی الاسلام اعظم گڑھ ص ۵

[2] بشیر احمد ص ۶۸ -

[3] بشیر احمد ص ۹۸ -

[4] محمد اللہ ص ۵۸ (بحوالہ حسن نظامی)، نیز ملاحظہ ہو۔ الفنسٹن ہسٹری آف انڈیا لندن ۱۹۱۶ء ص ۳۶۳ -

[5] برگس ہسٹری آف دی رائز آف محمڈن پاور ان انڈیا۔ کلکتہ ۱۹۰۸ء ص ۱۹۹ -

[6] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ محولہ صدر ص ۲۱ ۔

Marfat.com

سخت پابند[1] اور خلفاء راشدین کی پیروی کرتا تھا[2]۔ فخر مدبر نے ایبک کی عدل گستری کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

"عدل را بران جمله بنا نهاد که با چندان لشکر که در ضمن رایات عالیه بودند از ترک و غوری و خراسانی و خلجی و حشم هندوستان از اترکان و نوکران و باسیدان و تلفا ریق هیچ آفریده را زهره آن نبود که برگ کاه و تای نان و گوسفندی از صحرا و مرغی از آبادانی از کسی بستدی ۔ و یا خانه رعیتی ببیج کردی ۔ و منت بادشاه شهید را که تخم دهم و مرتی وی بوده و از و آموخته بود بعدل اقامت نموده"[3]

التمش نے انصاف چاہنے والوں کے لئے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگائی تھی[4] اور یہ دیکھنے کے لئے کہ عدل گستری خاطر خواہ ہو رہی ہے یا نہیں، وہ سلطنت کے دورے بھی کیا کرتا تھا[5]۔ التمش نے یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ جس کسی کو کوئی مصیبت پہنچے، رنگین لباس پہنے۔ التمش کے دربار میں بڑے بڑے فقہا اور ماہرین قانون جمع تھے۔ اس کے بعد رضیہ[6]، ناصر الدین محمود[7]، بلبن[8]، تغلق شاہ اور فیروز تغلق[9] وغیرہ نے انتظام انسق عدل کا بہت بلند معیار قایم کیا اور تمام سلاطین عدل گستری کو ایک مقدس مذہبی فرض

---

1. تاریخ فخر الدین مبارک شاہ بحوالہ صدر ص ۳۳-۳۴-۳۵
2. 〃 〃 ص ۵۴، ۶۰
3. 〃 〃 ص ۳۳
4. الیٹ بحوالہ صدر جلد سوم ص ۵۹۱ ابن بطوطہ
5. بشیر احمد ص ۹۸ - بحوالہ ابن بطوطہ و ابن بطوطہ، الیٹ بحوالہ صدر جلد سوم ص ۵۹۱
6. 〃 ص ۹۸ - الیٹ بحوالہ صدر جلد سوم ص ۵۹۱
7. برنی ص ۱۱۱-۱۱۲ ۔
8. منہاج ص ۱۸۵ نیز ملاحظہ ہو القنشمی بحوالہ صدر ص ۲۶۸ - الیٹ بحوالہ صدر جلد ۲ ص ۳۳
9. بشیر احمد ص ۹۹ - (بحوالہ ابن بطوطہ)
10. برنی ص ۳۹-۴۲
11. 〃 〃 ص ۱۴۴
12. 〃 〃 (۵۷۵-۵۷۸)، برگس بحوالہ صدر جلد ۱ ص ۴۶۱-۴۶۲-۴۶۴ -

سمجھتے رہے[۱]۔ بلبن نے تو خود اپنے رشتہ داروں کو بھی کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھا۔ ایک دفعہ بلبن کے ایک بڑے درباری امیر ملک بارک نے اپنے کسی ملازم کو مار ڈالا۔ جب اس کی بیوہ نے سلطان سے شکایت کی تو سلطان نے ملک بارک کو بیوہ کے سامنے اسی طرح قتل کروایا[۲]۔ بلبن نے ایک خفیہ محکمہ بھی قایم کیا تھا اور جاسوسوں کے ذریعہ محکمہ عدلیہ کی خوبیاں اور خرابیاں معلوم کرتا تھا[۳]۔ اگر جاسوس سلطان کو کسی معاملے کی خبر دینے میں تساہل کرتے تو ان کو سزا دی جاتی تھی[۴]۔ جب سیدی مولا پر بغاوت کا الزام عاید ہوا۔ تو جلال الدین خلجی نے یہ حکم دیا تھا کہ سیدی مولا اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے آگ پر چلے۔ اس پر قاضیوں نے سلطان سے کہا کہ آگ سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتی[۵]۔ سلطان نے قاضیوں کی بات تو مان لی لیکن سیدی مولا کو بعد میں قتل کر دیا[۶]۔ عوام اس سے ناراض ہوئے[۷]۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کے عدل و انصاف کے متعلق امیر خسرو نے لکھا ہے:

"و اگر از رقم نصفت این درگاه سلسلہ جنبانیده شود آہوئے دو شاخہ قلم زنجیر بوگرد شیران معنی نہد۔ زہی عادل کہ از مہابت عدل او پیابان مست در راه مور ریغہ کنان پائے بر زمین نہاده و پلنگان شیر گیر پیش محراب تیغ او از صبوحی خون حیوانات توبہ کرده محتسب انصاف او چنگ دنائے شیران شکستہ و دو رظالمان سگ روئے بر انداختہ و کاسہ سر عوانان خوک خوا نگونسار گردانیده۔ و خون جباران بز گیر[۸]"

۱۔ بشیر احمد ص ۹۹

۲۔ محمد اللہ ص ۵۸۔ ایشوری پرشاد ص ۱۶۰

۳۔ " ص ۵۸

۴۔ ایشوری پرشاد۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔ الہ آباد ص ۱۶۱

۵۔ برنی ص ۲۱۱۔

۶۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ایلیٹ بحوالہ صدر جلد ۳ ص ۱۴۴ تا ۱۴۵۔

۷۔ برنی ص ۲۱۲ ایلیٹ بحوالہ صدر جلد ۳ ص ۱۴۴-۱۴۶

۸۔ :۔ خزائن الفتوح از حضرت امیر خسرو دہلوی۔ علی گڑھ ..
۱۹۲۷ء ص ۱۸

Marfat.com

ابن بطوطہ نے جس کو محمد تغلق[1] نے دلی کا قاضی بنایا تھا، بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سخت گیر سلطان نے بھی قانون کی عظمت قایم رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ بقول ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق تمام سلاطین میں سب سے زیادہ منکسر المزاج اور سب سے زیادہ عادل واقع ہوا تھا[2]۔ ایک مقدمہ کے سلسلے میں محمد تغلق پیدل چلتا ہوا قاضی کے پاس آیا اور شیخ زادہ جامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے سلطان کو ظالم کہا تھا[3]۔ ایک دفعہ محمد تغلق قاضی کے سامنے بحیثیت مدعا علیہ بھی آیا اور جب اس کے خلاف فیصلہ ہوا تو خوشی سے سزا قبول کی[4]۔ کسی امیر نے قاضی کے سامنے شکایت کی تھی کہ سلطان نے : بھائی کو بلا وجہ سزا دی ہے۔ سلطان قاضی کے سامنے پیدل چلتا ہوا خالی ہاتھ آیا اور قاضی کو ادب سے سلام کیا۔ اتفاق سے اس مقدمے کا فیصلہ بھی سلطان کے خلاف صادر ہوا تو سلطان نے مدعی کو تاوان ادا کر دیا[5]۔ قاضی کو ہدایت تھی کہ جب سلطان عدالت میں آئے تو وہ سلطان کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ رہے۔ ایک اور مقدمہ میں کسی شخص نے سلطان پر بقایا رقم کا دعوے کیا تھا، سلطان فوراً قاضی کے سامنے حاضر ہو گیا اور اس کی رقم ادا کر دی[6]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سلاطین دہلی نے انصاف کی خاطر ایک منظم عدلیہ قایم کیا تھا۔ اور عدالتوں میں کھلی تحقیقات ہوتی تھی۔ ہندوستان کے باہر غالباً عدالتوں کی ایسی خاطر خواہ تنظیم نہ تھی اور نا انصافیوں کا یوں سد باب نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اختیارات اور ذمہ داریاں مملکت کے مختلف محکموں کے عہدہ داروں میں منقسم تھیں اور اس طرح "روک تھام"[7] کا ایک نظام قایم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض سلاطین نے قانون میں کچھ نئے عناصر بھی داخل کرنے کی

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر مہدی حسین دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق۔ لندن ۱۹۳۸ء
[2] محمد اللہ ص۶۰ - ماخوذ از ابن بطوطہ۔
[3] محمد اللہ ص۶۰ -
[4] قریشی ص۱۵۴-۱۵۵ -
[5] قریشی ص۱۵۵ -
[6] قریشی ص۱۵۵
[7] CHECKS AND BALANECS

کوشش کی۔ مثلاً علاؤ الدین خلجی نے اپنے قاضی القضاۃ مغیث سے کہا تھا کہ "ملک داری و جہان بانی علیحدہ کار لیست و احکام شریعت علیحدہ"[1] اور محمد تغلق نے بھی بعض وقت اپنے کو قانون ملک سے بالا تر سمجھنے کی کوشش کی[2] لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں بادشاہوں نے عوام کے سامنے برابر احکام شرع کی پابندی کی اور اس کا احترام کیا[3] یہ سلاطین بھی شرع کے کسی اصول میں کوئی نہ کر سکے۔ شریعت تو اس بات کو بالکل نہیں مانتی کہ حاکم وقت کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ برخلاف اس کے خود حاکم اسلام پر عدالت میں مقدمہ دائر ہو سکتا ہے۔ اور وہ خود کسی پر مقدمہ چلا سکتا ہے[4] علاؤ الدین خلجی اور محمد تغلق غالباً رائے عامہ سے مجبور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے ایک نااہل شخص یعنی ضیاء الدین کو قاضی القضاۃ بنایا تو شورش برپا ہوئی۔ اور قاضی اور سلطان دونوں قتل ہو گئے[5] اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی فیروز تغلق کے عہد میں ایک "ضابطہ"[6] مرتب ہوا۔ اور اس کی غرض یہ تھی کہ عوام کو صحیح قانون معلوم ہو اور اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے"

سلاطین اپنے مشورے کے لئے مفتیوں کو دربار میں جگہ دیتے تھے اور یہ ماہرین قانون سلاطین کو صحیح اصول اور قوانین سے واقف کراتے تھے[7] سلطان محمد تغلق نے اپنے محل میں چار مفتیوں کو مامور کیا تھا جن کے مشورے سے وہ فصل خصومات کرتا تھا[8] بقول

---

[1] برنی ص ۲۸۹۔ ملاحظہ ہو قاضی مغیث الدین سے گفتگو برنی ص ۲۸۹ - ۲۹۴ -
نیز فرشتہ ج ۱ ص ۱۱۰ - ۱۱۲ -

[2] برنی ص ۵۰۹ - ۵۱۰ - ۵۱۵ -

[3] بشیر احمد ص ۹۶ - فرشتہ ج ۱ ص ۱۱۰ - ۱۱۱

[4] محمد تغلق بنام شیخ زادہ جامی - بدایونی منتخب التواریخ - لکھنو ۱۸۶۵ء
ص ۲۳۹ وغیرہ -

[5] برنی ص ۴۰۵ - ۴۰۸

[6] بشیر احمد ص ۹۹ - ۱۰۰

[7] ر ر ص ۱۰۰

[8] محمد اللہ ص ۶۰

Marfat.com

برنی سلاطین کی نجات اسی میں تھی کہ وہ شرع کی پابندی کے ساتھ عدل وانصاف کریں۔[1] قانون کی خلاف ورزی ناممکن تھی۔[2] علاؤ الدین خلجی کے عہد کا نقشہ کھینچتے ہوئے برنی لکھتا ہے۔ اس عہد کے آخری عشرے میں مسلمان عام طور پر راست گو، حق پسند، ایماندار، متقی اور عدل پسند تھے۔[3]

جس طرح ابتدائی خلفائے اسلام عدالتوں کے فیصلوں کو مانتے تھے[4] اسی طرح سلاطین دہلی نے بھی اپنے آپ کو قانون ملک اور عدالتوں کا بالکل پابند سمجھا۔ اور اگر کسی نے اس سے روگردانی کی تو یہ بہت ناپسندیدہ حرکت سمجھی گئی۔ مثلاً محمد تغلق نے ایک شخص کے خلاف قاضی کی عدالت میں توہین کا مقدمہ بھیجا اور جب اس کے خلاف فیصلہ ہوا تو مدعی علیہ کو کسی اور بہانے سے گرفتار کر لیا۔[5] تمام مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا۔[6] اس طرح یہ ظاہر ہے کہ عدالتوں کو فصل خصومات میں آزادی حاصل تھی۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے ان کی اکثریت حنفی مذہب کی پیرو تھی۔ ہندوستان میں زیادہ تر ترک آئے ہیں اور یہ سب حنفی تھے۔[7] ترک خواہ غزنوی ہوں یا غوری یا سلجوقی سب حنفی مذہب کے سنی تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد غوری و شمسی حکمرانوں نے خلیفہ بغداد سے سند حاصل کی تھی اور یہ خلفا خود حنفی تھے۔ اگرچہ ترکستان میں اور مذہب بھی آئے، لیکن جب ہندوستان کی فتح مکمل ہوئی۔ اس وقت حنبلی اور شافعی مسلکوں کا اثر خراسان اور ماوراء النہر میں بہت کم ہو گیا تھا۔ اور چونکہ ان ہی مقامات سے علما ہندوستان آتے تھے۔ اس لئے لازماً ان کے ساتھ حنفی مذہب آیا۔ اس طرح بغداد کی طرف [illegible]

---

[1] برنی ص ۳۹-۴۰-۵۲-۵۳ ۔ التمش کی تقریر ص ۱۴۱-۱۴۲ ۔

[2] برنی ص ۱۴۱-۵۴ ۔

[3] " ص ۱۴۲

[4] امیر علی - اسپرٹ آف اسلام لندن ۱۹۴۹ء ص ۲۸۰ ۔

[5] بدایونی جلد ۱ ص ۲۳۹

[6] " " "

[7] ولسن ڈائجسٹ آف اینگلو محمڈن لا ۔ مرتبہ عبداللہ یوسف علی

Marfat.com

مذہب بھی حنفی تھا اور عدالتوں کو فصل خصومات کے لئے ذیل کی کتابوں اور قوانین سے استفادہ کرنا پڑتا تھا[1]

(۱) قرآن مجید (۲) سنن (۳) صحابہ کرام کی متفقہ آراء (۴) اجماع (۵) الہدایہ" بہت مقبول تھی - فتاوی قاضی خاں اور "فتاوی عالمگیر" کی ترتیب تک اسی سے کام لیا جاتا تھا ---- اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ کے اجتہاد کے مطابق قاضیوں کو استحسان[2] - استصلاح[3] استصحاب[4] کی روشنی میں کام کرنا پڑتا تھا - نیز عرف[5] - اور نظائر[6] کو بھی پیش نظر رکھا جاتا اور خاص صورتوں میں سلاطین اپنے فرامین کے ذریعہ بھی کسی قانون کی توضیح کرتے یا قاضیوں کو ہدایتیں دیتے تھے[7]

سلاطین کے خصوصی مراعات

مسلمان حکمران کو خواہ وہ خلیفہ ہو یا امام یا سلطان یا شہنشاہ، قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں - اس کا فرض صرف اتنا ہے کہ ملک میں شرع کی پابندی کروائے لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو ترکی اور ہندوستانی سلاطین نے اپنے فرامین کے ذریعہ بہت سے نئے اصول اور قوانین بنائے - گو ان سلاطین نے مذہبی قانون میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ لیکن ملکی تنظیم و نسق کے شعبے میں بیشتر جدید قوانین وضع کئے، اور سچ پوچھے تو خود شرعی قوانین میں بھی بعض تبدیلیاں کی گئیں - اسلام کا قانون تعزیرات تو بہت متاثر ہوا اور اس زمانے سے جب کہ چار مذاہب پیدا ہوئے تھے - مغلوں کے خاتمے تک اسلامی قانون تعزیرات اور سزاؤں کے طریقے برابر

---

[1] بشیر احمد ص ۷۰-۷۱ -
[2] مفاد عامہ -
[3] مصلحت عامہ -
[4] CONCORDANCE
[5] بشیر احمد ص ۷۲-۷۳ -
[6] " ص ۷۵ -
[7] " ص ۷۶-۷۷ -

بدلتے گئے[1] سلاطین دہلی کے فرامین کی بدولت جو قانون شاہی[2] قرار پاگیا۔ نیز ذمیوں کے متعلق جو اصول اور قوانین وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے۔ ان کو ایک طرح سے اسلامی مملکت کا JUS GENTIUM کہا جا سکتا ہے[3]

اسلامی حکمرانوں کو یہ حق حاصل تھا کہ سزاؤں کی تخفیف کر دیں۔ اگر غور کیا جائے تو خلفاء راشدین نے کبھی اس قسم کا کوئی حق استعمال نہیں کیا۔ لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں پہلی دفعہ امیر معاویہ نے یہ حق استعمال کیا[4] ہندوستان میں سلاطین دہلی نے تقریباً ہر قسم کے مقدمہ میں یہ حق استعمال کیا چنانچہ سرقے سے لے کر قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی سزاؤں میں بھی تخفیف کی[5] سلاطین خاص صورتوں میں عدالت ابتدائی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ طاقتور امراء کے معاملات میں سلاطین ہی کو فصل خصومات کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ یہ امراء سوائے سلطان کے کسی اور شخص کا فیصلہ نہیں مانتے تھے[6]

سلاطین کی حیثیت اعلیٰ ترین حاکم عدالت کی تھی۔ اور اس حیثیت سے وہ نظمہ عدلیہ کی دیکھ بھال کرتے، اور عدلیہ کے عہدہ داروں کا تقرر کرتے تھے۔ تاکہ وہ ایسے عہدہ داروں یعنی قاضیوں کے ذریعہ انصاف کر سکیں اور شاہ ازبکستان کی طرح صرف سلطان ہی عدالتیں قایم کر سکتے تھے[7]

---

[1] واحد حسین ص ۱۳۶

[2] " " ص ۱۳۸

[3] " " ص ۱۴۰-۱۴۲

[4] امیر علی - اسپرٹ آف اسلام ص ۲۸۰

[5] بشیر احمد ص ۷۹

[6] " ص ۸۰-۸۱

[7] مقابلہ کیجئے ہدایہ اور بلاکسٹن کی شروح جلد ۱ ص ۲۶۶

Marfat.com

محکمہ قضاء یا محکمہ عدلیہ

صدر مملکت کی حیثیت سے سلطان کے تین فرائض ایسے تھے۔ جو عدل گستری سے وابستہ تھے۔ اول یہ کہ سلطان دین اسلام کا محافظ اور رعایا کے باہمی مناقشوں میں حَکم تھا۔ دوسرے وہ نظام حکومت کا صدر تھا۔ تیسرے وہ فوجوں کا اعلیٰ ترین افسر تھا[1] پہلی حیثیت میں سلطان دیوان قضاء کے توسط سے دادرسی کرتا تھا۔ دوسری حیثیت میں دیوان مظالم کے ذریعہ اور تیسری حیثیت سے خود سلطان یا اس کے فوجی سپہ سالار فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کا اجلاس کرتے تھے اور باغیوں کو سزا دیتے تھے۔ فوجی تعزیر کے لئے محمد تغلق نے دیوان سیاست کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قایم کیا تھا۔ جس کے لئے خاص فقہا مقرر تھے[2] لیکن یہاں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ خود محمد تغلق نے جو بہت سخت گیر مشہور ہے، فقہا کی رائے کے بغیر بطور خود کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ دیوان قضا میں دو قسم کے عہدہ دار تھے۔ ایک تو مفتی تھے۔ جو اپنی فنی اور قانونی رائے دیتے تھے، اور دوسرے متفرض تھے جو امور متعلقہ اور واقعات کی چھان بین کرتے تھے[3] ان کے علاوہ عاملانہ عہدہ دار اور اہل عملہ بھی تھے جو "امیر" اور "معترف" کہلاتے تھے۔ اس بات کی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ فوجی گورنروں کو بغاوت کے جرائم کے

---

[1] قریشی ص ۱۴۹

[2] برنی ص ۴۹۷

[3] " " "

[4] قریشی ص ۱۵۰

Marfat.com

جرائم کے متعلق کیا اختیارات حاصل تھے۔ چونکہ جنگی قیدی اور باغی عام طور پر دہلی بھیج دیئے جاتے تھے[1] اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ گورنروں کو سخت سزائیں دینے کا اختیار نہ تھا۔ جب کبھی دارالسلطنت سے ہدایت وصول ہوتی تو باغیوں کو صوبے میں بھی سزا دی جاتی تھی[2]

دیوان مظالم

دیوان مظالم ایک منظم ادارے کی شکل میں خلیفہ چہارم کے زمانے سے چلا آتا ہے۔[3] عباسی خلفاء نے کبھی بطور خود اس کی صدارت کی اور کبھی اپنے وزیروں کو اس کام کے لئے مامور کیا[4] دلی میں سلطان کی عدم موجودگی میں امیر داد دیوان مظالم کی صدارت کرتا تھا۔[5] بقول ابن بطوطہ سلطان ہر دوشنبہ و پنجشنبہ کو مقدمات کی سماعت کے لئے بیٹھتا تھا[6] طریقہ کارروائی یہ تھا کہ پہلے "حاجب" کے پاس شکایت جاتی تھی۔ اگر "حاجب"[7] کے اجلاس سے اطمینان بخش فیصلہ نہ ہوتا تو پھر مستغیث قاضی ممالک کے پاس پیش ہوتا[8] اس کے بعد آخری مرافعہ سلطان کے پاس ہوتا تھا اور مظلوم بہت آسانی سے بادشاہ کے پاس رسائی حاصل کر سکتا تھا[9] صبح الاعشیٰ میں "مظالم" کی عدالت کا ایک دلچسپ نقشہ کھینچا گیا ہے[10] سلطان ایک اونچے سنہرے تخت پر بیٹھتا اور اس کے ارد گرد محافظ دستہ اور عہدہ دار ہوتا۔ سلطان کے برابر میں قاضی

---

[1] برنی ص۳۲۰-۳۲۱۔

[2] قریشی ص۱۵۰

[3] " ص۱۵۰

[4] جرجی زیدان کے حوالے سے قریشی ص۱۵۰

[5] مقابلہ کیجئے منہاج ص۲۲۲، ۲۷۶ اور قریشی ص۱۵۰

[6] قریشی ص۱۵۰

[7] فیروز بھی جو بعد میں سلطنت کا وارث بنا حاجب مقرر ہوا تھا۔

[8] قریشی ص۱۵۰

[9] " " (بحوالہ ابن بطوطہ)

[10] " ص۱۵۰-۱۵۱

Marfat.com

ممالک بیٹھتا جو سلطان کو قانونی مشورے دیتا تھا۔ جب عدالت کے جوان آغاز کار روائی کا اعلان کرتے، تو پھر مستغیث اپنی شکایتیں لے کر آگے بڑھتا۔ جس دن سلطان اجلاس نہ کرتا تو حاجب عرضیاں وصول کرتے اور صدر حاجب کے پاس روانہ کر دیتے اور بالآخر یہ سلطان کے حضور میں پیش کی جاتی تھیں۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں وزیر ہی دیوان مظالم کی صدارت کرتا تھا، اور وزیر کے قانونی مشورے کے لئے قاضی موجود ہوتا تھا۔ جس کو بارہ بارہ ماہرین فقہ کی مدد حاصل تھی[1] جب سلطان دورے پر باہر نکلتا تو اس وقت بھی لوگوں کو عرضیاں پیش کرنے کی اجازت تھی۔

دیوان قضاء

دیوان قضاء کا مخصوص کام گو دیوانی مقدموں کی سماعت تھا، لیکن محکمہ سیاست اور دیوان مظالم سے بھی اس کا کچھ تعلق ہوتا تھا۔ دراصل "قضاء" قانون عام (کامن لا) اور "سیاست" و "مظالم" انتظامی قانون[2] کی اساس تھی[3] دیوان قضا اور مملکت کے عدلیہ کا صدر قاضی ممالک ہوتا تھا، جس کو قاضی القضاۃ بھی کہتے تھے[4] سلاطین دہلی کے عہد میں صدر الصدور کا اہم عہدہ بھی اسی سے وابستہ کر دیا گیا۔ چونکہ قاضی القضاۃ کی خدمت بہت اہم اور بڑی ذمہ داریوں کی حامل تھی، اس کے ساتھ ایک نائب قاضی" بھی ہوتا تھا۔ جو بجائے خود غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا[5] قاضی القضاۃ کو محمد تغلق کے زمانے میں سالانہ ساٹھ ہزار تنکہ مشاہرہ ملتا تھا[6] محکمہ عدلیہ اور محکمہ امور مذہبی کے تمام امور اسی سے متعلق تھے۔ یہ اپنے ماتحت عدالتوں کے مرافعے سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضیوں کا تقرر بھی کرتا تھا[7] فروغ میں تو یہ تھا کہ قاضی القضاۃ

---

[1] قریشی ص ۱۵۱ - (ماخوذ از داودی و مجامع الاخبار) -

[2] DROIT ADMINISTRATIF

[3] قریشی ص ۱۵۱

[4] " " بشیر احمد ص ۱۰۷

[5] برنی ص ۳۵۱

[6] الیٹ جلد ص ۵۷۸ -

[7] قریشی ص ۱۵۱

Marfat.com

ہی دہلی میں عدالت ابتدائی کا کام انجام دیتا تھا[1]۔ لیکن بعد میں دارالسلطنت کے لئے ایک علیحدہ قاضی مقرر ہوگیا۔ اس عہدہ پر ابن بطوطہ کا بھی تقرر ہوا تھا اور اس کو بارہ ہزار تنکہ[2] سالانہ دیئے جاتے تھے۔ ابن بطوطہ کی مدد کے لئے مزید دو قاضی مقرر تھے۔ دارالسلطنت کے قاضی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خود سلطان نے ابن بطوطہ کو عہدہ قضا پر فائز کیا اور خود قاضی کے سامنے کھڑے ہو کر قاضی کو ہمارے سرکار اور آقا سے خطاب کیا[3]

صدر جہان یا صدر کل

نظام عدلیہ میں ایک اور عہدہ وجود میں لایا گیا تھا، جس کو صدر کل یا صدر جہاں کہتے تھے۔ چیف جسٹس یا قاضی القضاۃ دراصل ۱۲۰۶ء سے ۱۲۴۸ء تک سلطنت کے محکمہ عدلیہ کا صدر رہا۔ لیکن اس کے بعد سلطان ناصرالدین نے ۱۲۴۸ء میں صدر جہاں کا ایک اور اعلیٰ عہدہ قایم کیا اور قاضی القضاۃ منہاج سراج کو یہ خدمت دی گئی[4] سلطان ناصرالدین نے جب دیوان مظالم قایم کیا تو منہاج سراج کو ہی اس کا صدر بنایا۔ اسی زمانے سے صدر جہاں محکمہ عدلیہ کا صدر سمجھا جانے لگا[5] اور محکمہ امور مذہبی بھی اس کی زیر نگرانی رہا[6] عدلیہ کی حد تک اس کے فرائض تقریباً وہی تھے۔ جو انگلستان کے لارڈ چانسلر کو حاصل ہیں[7] خاص صورتوں میں صدر جہاں عدالت شاہی میں مقدموں کی سماعت کرتا اور ابتدائی مقدموں کا کام بھی کرتا تھا[8] صدر جہاں کی سفارش سے قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا اور اس کے دفتر سے احکام تقرر جاری ہوتے تھے[9]

---

[1] قریشی ص ۱۵۱

[2] " " "

[3] " (بحوالہ ابن بطوطہ)

[4] بشیر احمد ص ۱۰۵

[5] برنی ص ۵۸۰

[6] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی باب ۱۹۔

[7] بشیر احمد ص ۱۰۵

[8] بدایونی منتخب التواریخ خولہ صدر جلد ۱ ص ۲۳۹

[9] بشیر احمد ص ۱۰۵

Marfat.com

جب قاضی منہاج سراج ۱۲۴۸ء میں صدر جہاں بنائے گئے تو قاضی القضاۃ کے عہدے پر قاضی ضیا الدین فائز ہوئے جو محکمہ عدلیہ کے اکثر و بیشتر کاموں کو انجام دیتے تھے[1] صدر جہاں کی شکل میں قاضی القضاۃ سے علیحدہ ایک نیا عہدہ بنانا مقصود تھا[2] بعد میں علاؤالدین خلجی نے قاضی صدر الدین عارف کی ذات میں یہ دونوں عہدے ضم کر دیئے[3] پھر فیروز تغلق نے عارضی طور پر ان دونوں عہدوں کو علیحدہ رکھا[4] لیکن عام طور پر قاضی القضاۃ اور صدر جہاں کے دونوں عہدوں پر ایک ہی شخص فائز ہوتا تھا۔

صدر جہاں کا عہدہ تاحیات ہوتا تھا[5] اور فرمان تقرر[6] کے مطابق اس کے چار اہم فرائض تھے۔ پہلا فرض تو قضاء یعنی فصل خصومات تھا۔ دوسرا عطائے خطابات۔ تیسرا امامت اور چوتھا "سارے امور شرعی کا احتساب"[7] اور بقول برنی[8] صدر جہاں عدلیہ کے عہدہ داروں اور محکمہ تعلیم کے تمام امور کی نگرانی کرتا تھا اور شرعی امور میں پوری طرح مطلق العنان تھا۔ صدر کے محکمہ سے علماء کو وظیفے ملتے۔ غریبوں کو زمینیں دی جاتی تھیں اور ان عطیوں سے متعلق تمام شکایتیں صدر جہاں کے پاس ہی آتیں[9] صوبوں میں صدر صوبہ اور اضلاع میں صدر سرکار اس کی نمائندگی کرتے تھے[9]

صدر جہاں یا اس کے محکمہ کو دیوان سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ایک عارضی عدالت

---

۱ بشیر احمد ص ۱۰۵-۱۰۶۔

۲ " " " " ۔

۳ فرشتہ ج ا ص ۱۲۱۔ پر لکھتا ہے: قاضی صدر الدین عارف کہ قضائے ممالک و خطاب صدر جہاں داشت۔ بود از د قاضی جلال الدین......

۴ برنی ص ۵۷۹-۵۸۰۔

۵ بشیر احمد ص ۱۰۶۔

۶ منہاج ص ۱۷۵۔

۷ برنی ص ۵۸۰۔

۸ " " ۔

۹ بشیر احمد ص ۱۰۶۔

Marfat.com

تھی جو صرف محمد تغلق کے زمانے میں قایم ہوئی۔ اور اس کے جانشینوں نے اُسے ختم کر دیا چونکہ صدر جہاں کے بہت وسیع اختیارات اور فرایض تھے اور وہ ہر وقت عدالت میں حاضر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے قاضی القضاۃ اور اس کے مددگار قاضی ان تمام مرافعوں کی سماعت کرتے تھے، جو دیوان مظالم میں یا دیوان سیاست میں صوبجاتی قاضیوں یا گورنروں کے فیصلوں کے خلاف آتے تھے۔

قاضی

ہر شہر اور ہر قصبہ میں قاضی مقرر ہوتے تھے اور ملک کے نظم و نسق کا سب سے پہلا اور اہم فرض یہی سمجھا جاتا تھا کہ قاضیوں کا تقرر کیا جائے[1]۔ صدر جہاں کے بعد قاضی القضاۃ ہی سلطنت کا سب سے اعلیٰ عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ قاضی القضاۃ کا تقرر خود سلطان کرتا تھا۔ اور اس خدمت پر ایسے لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا جو بلند کردار اور فقہی معلومات میں علامہ روزگار ہوتے تھے[2]۔ بادشاہوں نے قاضی القضاۃ کو اپنے منصب سے علیحدہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ قاضی جلال الدین کاشانی کو سلطان معز الدین بہرام نے علیحدہ کر دیا[3] اور قاضی عماد الدین شکور خانی کو ۱۲۴۸ء میں برطرف کر دیا[4]۔ سلطان معز الدین بہرام نے قاضی شمس الدین کو بغاوت کے الزام میں موت کی سزا دی[5]۔

قاضی القضاۃ کے فرائض میں عدلیہ کے کام کے علاوہ یہ فریضہ بھی داخل تھا کہ سلطان کے سامنے عہدے کی قبولیت کا حلف اٹھائے[6] اور سلطان کی تخت نشینی کے وقت موجود رہے[7]۔ قاضی القضاۃ اور دارالخلافہ کے دیگر قاضی کبھی کبھی سلطان کو مدعو بھی کرتے تھے[8] سلطنت

---

[1] قریشی صہ ۱۵۲

[2] برنی صہ ۳۵۱-۳۵۲-۵۷۹-۵۸۰۔

[3] منہاج صہ ۱۹۴۔ برگس جلد ۱ صہ ۲۲۵۔

[4] الیٹ جلد ۲ صہ ۳۴۹

[5] برگس جلد ۱ صہ ۲۲۵

[6] بشیر احمد صہ ۱۰۹

[7] " "

[8] " "

Marfat.com

کے قواعد یا قوانین بناتے وقت قاضی القضاۃ سے مشورہ کیا جاتا تھا[1] بعض اوقات قاضی القضاۃ کو سفارتی مہم پر بھی روانہ کیا جاتا تھا[2] بعض دفعہ قاضی القضاۃ کے تحت تعلیمی ادارے بھی رکھے گئے۔[3]

ابتدائی زمانے میں تو قاضی کے فرائض صرف فصل خصومات سے متعلق تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے فرائض اور اختیارات میں توسیع ہوتی گئی۔ چنانچہ یتیموں اور مجنونوں کی جائداد کی نگرانی۔ وصایا کی سرانجام دہی اور اوقاف کی نگرانی سب ہی اس سے متعلق ہو گئے۔ بلکہ قاضی بیواؤں کے عقد ثانی کا بھی انتظام کرتا تھا۔ نیز سڑکوں اور لاوارث جائداد کا انتظام بھی اس سے متعلق ہو گیا تھا[4] متنازعہ جائدادوں کے متعلق یہ حکم تھا کہ وہ قاضی کے پاس امانتاً رکھی جائیں[5] مقامی گورنر اور عہدہ داروں کو تاکید تھی کہ وہ قاضی کے ساتھ پورا تعاون کریں اور قانون کی عظمت قایم رکھیں۔ قاضی اپنے فیصلوں کی نظر ثانی بھی کر سکتا تھا۔

سلطنت دہلی کے بہت سے قاضی القضاۃ[6] غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے۔ بقول برنی قاضی صدر الدین عارف جو صدر جہاں اور قاضی القضاۃ تھا۔ اس قدر وسیع معلومات رکھتا تھا اور اتنا مردم شناس تھا کہ اس کی عدالت میں کوئی شخص جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرتا اور نہ حیلہ حوالہ کرتا[7] سلطان علاؤ الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین میں کئی دفعہ کشمکش ہو گئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان نے قاضی مغیث سے دیوگیر کے مال غنیمت کے متعلق پوچھا کہ یہ دولت کس کی ملک ہے۔ قاضی نے کہا شرعاً بیت المال کی ملک ہے کیونکہ

---

[1] بشیر احمد ص ۱۰۹۔
[2] منہاج ص ۲۲۳۔
[3] بشیر احمد ص ۱۰۹۔
[4] قریشی ص ۱۵۲
[5] " " "
[6] مشہور قاضیوں کی فہرست جو اس عہدے پر مامور تھے۔ ملاحظہ ہو بشیر احمد ص ۱۱۴
[7] برنی ص ۳۵۱

اسلامی فوج نے اسے حاصل کیا ہے۔ اس پر علاؤالدین نے پوچھا کہ ـــ بیت المال پر میرا اور میرے ورثا کا کیا حق ہے۔ قاضی نے جواب دیا کہ اگر آپ خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلیں تو آپ کو اس قدر حصّہ کا حق ہے جتنا کہ ہر سپاہی یا افسر لیتا ہے۔ لیکن اگر آپ ضرورت سے زیادہ حصّہ لیں تو پھر آپ کو خدا کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔[1] علائی عہد کے ایک اور قاضی علاء الملک بہت مشہور ہیں۔ جب سلطان نے ساری دنیا فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک نئے مذہب کی ایجاد کا خیال کیا تو قاضی نے کہا کہ مذہب اور قانون آسمانی ہدایتوں سے وجود میں آتے ہیں۔ بادشاہوں کے منصوبوں سے نہیں بن سکتے۔ سلطان کو چاہیئے کہ صرف ہندوستان کی حد تک اپنے کو مستحکم کرے۔[2] محمد تغلق نے قاضی القضاۃ کی عدالت سے اپنا ایک مقدمہ اٹھا لیا کیونکہ عدالت نے اس کی طرف داری سے انکار کر دیا تھا۔[3]

قاضی القضاۃ کے مددگار عہدہ دار

(۱) مفتی ... مشہور فقیہہ ہوتے تھے، جو قاضی کو قانونی مشورہ دیتے۔ مفتی اور قاضی میں اختلاف ہونے پر سلطان سے مشورہ کیا جاتا تھا۔[4]

(۲) پنڈت ... ہندوؤں کے دیوانی معاملات میں مفتیوں کی طرح پنڈتوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔[5]

(۳) محتسب[6] ... عام اخلاق کی نگہداشت کرتے تھے اور کمزوروں کو ظالموں سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔[7] دراصل بغداد میں ایک محکمۂ الحسبہ قایم تھا۔[8] جو قانون ملک اور عام، کم

۱۔ محمد اللہ ص ۵۹۔ فرشتہ جلد ۱ ص ۱۱۱ ۔

۲۔ " ص ۵۹

۳۔ بدایونی جلد ۱ ص ۲۳۹

۴۔ بشیر احمد ص ۱۱۵

۵۔ " "

۶۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدا بخش ہسٹری آف دی اسلامک پولیس [illegible]
ص ۲۹۲-۱۹۶۔ قریشی ص ۱۵۵-۱۶۴۔ برنی ص ۲۲۱

۷۔ قریشی ص ۱۵۵-۱۶۰ ۔

۸۔ بشیر احمد ص ۱۱۶ ۔

Marfat.com

کی پابندی کرواتا تھا[1] اس کے مطابق دلی میں بھی یہ محکمہ قایم ہوا۔ محتسب کا یہ فرض تھا کہ وہ مسجدوں میں دورہ کرے کہ آیا نماز برابر ہوتی ہے یا نہیں[2] شاہراہ عام یا عام مقامات پر کسی شخص کو نشہ کی حالت میں نہ آنے دے۔ منشیات یا آلات موسیقی عام طور پر فروخت نہ ہونے دے[3] محتسب یہ بھی دیکھتے تھے کہ کوئی شخص ناپ تول وغیرہ میں کسی کو کوئی فریب یا دہوکہ تو نہیں دے رہا ہے[4] محتسب قرض داروں کو مجبور کرتے تھے کہ قرض خواہوں کے قرض ادا کریں اور اگر مدیون انکار کرتے تو معاملہ قاضی کے پاس جاتا تھا۔ قاضی اور محتسب میں بڑا فرق[5] یہ تھا کہ قاضی کے پاس جب تک معاملہ مقدمہ کی شکل میں نہ آتا، وہ دخل نہیں دیتا تھا۔ اور محتسب لوگوں کے معاملات میں دخل دیتا تھا[6] نیز محتسب عاملہ کا عہدہ دار تھا اور قاضی محکمہ عدلیہ کا[7]

(۴) قاضی القضاۃ کی مدد کے لئے ایک اور عہدہ دار "داد بک"[8] بھی ہوتا تھا[9]۔ داد بک صوبوں میں بھی متعین تھے۔ اور یہ دراصل قاضیوں کے انتظامی مددگار تھے۔ داد بک کا فرض یہ تھا کہ ہر وہ شخص جس کے نام عدالت سے حاضری کا حکم نامہ دیا جائے۔ برابر عدالت میں حاضر رکھا جائے۔ نیز ضبطیوں کو ترتیب کے ساتھ رکھے[10]۔ اور موجودہ زمانے کے رشتہ دار عدالت کا کام کرے[11]۔

---

(۱) خدابخش ص۲۹۲-۲۹۶ -
(۲) " ص۲۹۳
(۳) " ص۲۹۴
(۴) قریشی ص۱۵۶
(۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدابخش ص۲۹۲-۲۹۳
(۶) خدابخش ص۲۹۳
(۷) " کلکتہ ۱۹۱۴ء ص۲۹۲ - اور ریبنٹ انڈ رکیلفس کلکتہ ۱۹۱۴ء ص۲۹۲
(۸) برنی ص۱۴۸
(۹) راورٹی ترجمہ — طبقات ناصری لندن ۱۸۸۱ء ص۷۹۰ -
(۱۰) راورٹی ص۷۹۰
(۱۱) بشیر احمد ص۱۱۹-۱۲۰ -

امیر داد

عدلیہ کے سلسلے میں ایک اور اہم عہدہ دار غور طلب ہے جو امیر داد کہلاتا تھا۔ دارالسلطنت میں امیر داد ایک اہم شخصیت کا مالک تھا۔ وہ سلطان کی عدم موجودگی میں عدالت مظالم کی بھی صدارت کرتا تھا[1] اور جب سلطان دارالسلطنت میں موجود ہوتا تو امیر داد کا کام عاملانہ اور انتظامی شکل اختیار کر لیتا[2]۔ عام طور پر امیر داد کردار اور قابلیت کے لوگ ہوتے تھے، اور ان کی تنخواہ بھی زیادہ ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ گورنروں اور سپہ سالاروں کی شکایتیں سننے کے مجاز ہوتے تھے[3]۔ محمد تغلق کے عہد میں امیر داد کو پچاس ہزار "تنکہ" سالانہ دیئے جاتے تھے[4]۔ صوبوں اور فوجوں میں امیر داد کے نائب کام کرتے تھے[5]۔ امیر داد کا بڑا کام یہ ہوتا تھا کہ قاضیوں کے فیصلوں کی تعمیل کروائے اور قاضی جو سزا سناتے تھے، اس کا نفاذ کرے[6]۔ اگر امیر داد کو یہ شبہ ہوتا کہ قاضی نے فیصلے میں کوئی غلطی کی ہے تو وہ قاضی کو اس طرف متوجہ کرتا تھا۔ نیز قاضیوں کے متفقہ فیصلے یا اعلیٰ عدالت کے فیصلے تک تعمیلی کارروائی ملتوی رکھتا تھا[7]۔ کوتوال، پولیس اور محتسب پر بھی اس کو اقتدار حاصل تھا[8]۔ امیر داد کے دفتر میں وہ تمام دستاویزات اور وثیقے محفوظ ہوتے تھے، جن کو قاضی کی توثیق حاصل ہو جاتی[9]۔

عدلیہ کے اس مختصر سے مطالعہ کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ سلطنت دہلی میں کون سی عدالتیں تھیں اور ان کی نوعیت کیا تھی! اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ سلطنت کی انتظامی تقسیم کو پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ (۱) دارالسلطنت (۲) صوبوں یا اقطاع (۳) ضلع یا سرکار (۴) پرگنے اور (۵) دیہات کی عدالتیں کون کون سی تھیں نیز یہ کہ (۶) فوج کی عدالت کس نوعیت کی تھی؟

۱؎ قریشی ص۱۵۳ ۲؎ منہاج ص۲۷۴-۲۷۷۔ ۳؎: آداب الملوک اور کفایۃ الملوک کے حوالے سے قریشی ص۱۵۳

۴؎ قریشی ص۱۵۳

۵؎ برنی ص۳۵۸-۳۶۱

۶؎ قریشی ص۱۵۳

۷؎ " " " (ماخوذ از آداب الملوک)

۸؎ قریشی ص۱۵۳

۹؎ " ص۱۵۳-۱۵۴۔

Marfat.com

دارالسلطنت کی عدالتیں

مرکز میں حسب ذیل عدالتیں تھیں[1] :-

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
۱) دیوان مظالم	فوجداری مرافعوں کی اعلےٰ ترین عدالت	صدر جہان
۲) دیوان رسالت	دیوانی " " "	"
۳) عدالت شاہی	ہر قسم کے مقدمات پیش ہوتے۔	سلطان
۴) عدالت قاضی القضاۃ	" " "	قاضی القضاۃ
۵) عدالت صدر جہاں	امور مذہبی سے متعلق مقدمات -	صدر جہان
۶) دیوان سیاست	تعزیزی جرایم سے متعلق عارضی طور پر قایم ہوئی تھی۔	محمد تغلق

اس نقشہ کے مطابق دارالسلطنت میں چھ قسم کی عدالتیں موجود تھیں - لیکن جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، صدر جہان یا صدر الصدور کا عہدہ جب قاضی القضاۃ کے عہدے سے الگ رہا، صرف اسی وقت یہ تعداد صحیح تھی - اور جب صدر جہان اور قاضی القضاۃ دونوں عہدوں پر ایک ہی شخصیت کام کرتی تھی - اس وقت اس نقشے میں دونوں کا فرق باقی نہیں رہتا - فوجداری اور دیوانی قسم کے مقدموں کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتیں یعنی "مظالم" اور "قضا" تو موجود تھیں - لیکن "مظالم" کی بقول قریشی صرف سلطان صدارت کرتا تھا - اور سلطان کی عدم موجودگی میں امیر داد دیوان مظالم کا صدر ہوتا تھا[2] لیکن بشیر احمد نے صدر جہان کو مظالم کا صدر بتایا ہے - حالانکہ صدر جہان ہمیشہ اس کی صدارت نہیں کرتا تھا - نیز دیوان رسالت کی بجائے نقشہ میں دیوان قضا لکھنا چاہئے تھا - کیوں کہ دیوان رسالت تو قرون وسطی کا دفتر معتمدی تھا، جس کی صدارت دیوان انشا یا نائب دیوان انشاء کرتا تھا چنانچہ خود ابوالفضل بیہقی ان دونوں عہدوں پر فائز رہا ہے - چوں کہ صدر جہان یا صدر الصدور اور قاضی القضاۃ سلطنت دہلی میں عام طور پر ایک ہی شخص رہا ہے[3] اس لئے یہ کہنا صحیح

---

۱. بشیر احمد ص ۱۰۴ -

۲. قریشی ص ۱۵۳ -

۳. " ص ۱۵۱ -

ہوگا کہ دیوان قضا کا عہدہ دار قاضی القضاۃ ہی تھا۔ عدالت شاہی ہر سلطان کے زمانے میں قایم رہی اور اس میں ابتدائی اور مرافعہ دونوں نوعیت کے مقدمے آتے تھے۔ البتہ عدالت قاضی القضاۃ اور عدالت صدر جہان ایسی عدالتیں تھیں، جو صدر جہان کے قاضی القضاۃ سے علیحدہ عہدہ دار ہونے کی صورت میں قایم رہیں۔ دیوان سیاست کو ایک عارضی عدالت سمجھنا چاہیئے، کیوں کہ یہ صرف محمد تغلق کے زمانے میں ہی قایم تھی اور محمد تغلق نے اپنے کو اعلےٰ ترین حاکم عدالت سمجھا تھا[1] اس لئے دیوان سیاست کا تذکرہ بھی اس نقشے میں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

واحد حسین نے سلطنت دہلی کی حسب ذیل عدالتیں بتائی ہیں[2]

عدالت	عہدہ دار
۱) عدالت شاہی	سلطان
۲) چیف کورٹ آف جسٹس	میر عدل
۳) عدالت قاضی القضاۃ	قاضی القضاۃ
۴) عدالت تحت متعلق امور مذہبی	قاضی
۵) عدالت تحت متعلق قانون ملک (کامن لا)	عادل یا قاضی

لیکن یہ تقسیم بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سلطنت دہلی کی عدالتیں جو دارالسلطنت میں تھیں، حسب ذیل ہیں۔

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
۱) عدالت شاہی	ابتدائی و مرافعہ	سلطان
۲) دیوان مظالم	مرافعہ فوج داری	سلطان یا امیر داد (یا بقول بشیر احمد صدر جہان)
۳) دیوان قضا	دیوانی مرافعہ	صدر جہان یا قاضی القضاۃ
۴) عدالت امور مذہبی	معاملات امور مذہبی	"
۵) عدالت ماتحت مظالم	ابتدائی قسم کے فوج داری مقدمات	قاضی یا مددگار امیر داد

---

[1] محمد التد صـ۵۹-۶۰-

[2] واحد حسین ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ دی مسلم رول ان انڈیا یونیورسٹی آف کلکتہ ۱۹۳۴ء صـ۲۹

Marfat.com

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
۶) عدالت ماتحت قضاء۔	ابتدائی قسم کے دیوانی مقدمات	قاضی
۷) دیوان ریاست ۔	متعلق محکمہ احتساب	محتسب
۸) عدالت قاضی اردو ۔	فوجی چھاؤنی کی عدالت	قاضی اردو[1]

یہ نقشہ سلطنت دہلی کے تقریباً ہر سلطان کے زمانے میں صحیح بیٹھتا ہے۔

دیوان ریاست

اس موقع پر دیوان ریاست کا مختصر سا تذکرہ بھی ضروری ہے یہ دراصل محتسب کی عدالت تھی، جہاں ان بیوپاریوں کو سزا دی جاتی تھی، جو ناپ تول میں دھوکہ دیتے یا کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ ملا دیتے تھے[2]۔ منڈیوں کا پورا انتظام ایک ماتحت افسر کرتا تھا، جو رئیس کہلاتا تھا۔ رئیس اشیاء کی مناسب قیمتیں مقرر کرتا اور بیوپاریوں اور خریداروں دونوں کا مفاد پیش نظر رکھتا[3]۔ محتسب کا یہ محکمہ دیوان ریاست یا دیوان عدل کہلاتا تھا۔ خلافت میں تو "معدل" کا یہ فرض تھا کہ دستاویزات کی رجسٹری کرے۔ اور کوئی شخص عدالت میں بطور گواہ کے پیش ہو تو اس کے متعلق عدالت کے لئے ضروری معلومات فراہم کرے[4]۔ لیکن سلطنت دہلی نے "معدل" کا یہ فرض "داد بک" کو تفویض کر دیا اور "عدل" کا لفظ دیوان ریاست سے متعلق ہو گیا۔ دیوان ریاست کا قیام معاشی نظام پر قابو رکھنے کا اچھا حربہ تھا اور اس کی صحیح افادیت علاؤ الدین خلجی کے عہد میں نظر آتی ہے۔ اس نے اشیاء کی قیمتوں کا تعین اور منڈیوں پر قابو رکھنے کے لئے یعقوب نامی ایک افسر کو رئیس مقرر کیا تھا[5]۔

---

[1] بدایونی منتخب التواریخ جلد ۱ ص ۱۷۰

[2] قریشی ص ۱۶۰

[3] " ص ۱۶۰-۱۶۱

[4] " ص ۱۶۱

[5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی ص ۱۶۱-۱۶۲

Marfat.com

(٢) صوبوں یا اقطاع کی عدالتیں حسب ذیل تھیں[١]

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
١) عدالت ناظم صوبہ	ابتدائی و مرافعہ	گورنر
٢) عدالت قاضی صوبہ	ابتدائی و مرافعہ امور مذہبی و قانون ملک۔	قاضی صوبہ
٣) گورنر کی مجلس عدالت	صوبہ کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ	گورنر وغیرہ
٤) عدالت دیوان صوبہ	عدالت مال۔ ابتدائی و مرافعہ	دیوان صوبہ
٥) عدالت صدر صوبہ	امور مذہبی	قاضی صوبہ اور صدر صوبہ (متفقہ اجلاس)

صوبوں میں گورنر یا ناظم صوبہ سلطان کی نمائندگی کرتا تھا اور یہی سلطان کی طرح ابتدائی استغاثے اور مرافعوں کی سماعت کرتا تھا۔ ابتدائی مقدموں میں تو یہ تنہا اجلاس کرتا تھا۔ اور جب اس کے فیصلوں سے تشفی نہیں ہوتی تو فریق مقدمہ دارالسلطنت کی عدالت مرافعہ میں چارہ جوئی کرتے تھے۔ لیکن جب گورنر کے پاس صوبے کے دیگر عہدہ داروں کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ ہوتا تو اس کی سماعت کے لئے ایک مجلس منعقد ہوتی جو قاضی صوبہ اور گورنر پر مشتمل ہوتی۔ اس مجلس میں نہ صرف تمام صوبہ داری عدالتوں کے مرافعے پیش ہوتے تھے۔ بلکہ خود قاضی صوبہ کے فیصلوں کے مرافعے بھی آتے تھے۔ ایسی صورت میں غالباً قاضی صوبہ مجلس کا رکن نہ ہوتا تھا۔ مجلس کے فیصلوں سے بھی تشفی نہ ہوتی تو دارالسلطنت کی عدالت مرافعہ میں چارہ جوئی ہوتی۔[٢] مالگزاری سے متعلق مقدمات گورنر یا دیوان کے پاس آتے تھے اور قاضیوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔[٣]

صوبے کا سب سے بڑا قاضی صوبہ تھا اور اس کو دیوانی و فوجداری دونوں قسم کے اختیارات حاصل تھے۔[٤] قاضی صوبے کے تمام نظام عدلیہ کا ذمہ دار اور اعلیٰ افسر تھا۔ اس کے اختیارات

١؎ بشیر احمد ص ١٠٧

٢؎ " " ص ١١٦ - ١١٨

٣؎ " " ص ١١٨

٤؎

غیر محدود تھے۔ اور اضلاع سے اس کے پاس مرافعے آتے تھے۔ قاضی صوبہ کا درجہ صوبہ کے گورنر کے بعد سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ گورنر کے ماتحت نہ تھا۔ جو کارروائیاں مذہب کے خلاف ہوتی تھیں، ان کے انسداد کے لئے مخصوص عدالتوں کا بھی قیام عمل میں آتا تھا اور قاضی صوبہ ان عدالتوں کی صدارت کرتا تھا[١]

قاضی صوبہ کا انتخاب دارالسلطنت کا قاضی القضاۃ یا صدر جہان کرتا۔ اور سلطان کے فرمان سے اس کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ قاضی کے تقرر کی شرط یہ تھی کہ وہ جید عالم اور فقیہ ہو۔ اور بقول برنی ''شرط قضا علم تنہا نیست۔ بلکہ از لوازم شرط قضا تقویٰ است ... نجات بادشاہ نباشد تا قضا بہ متقی ترین علماء بلاد و ممالک خود نہ دہد[٢]''۔ قاضیوں کا ایک صوبہ سے دوسرے صوبے کو تبادلہ بھی ہوا کرتا۔ نیز قاضی کا تنزل بھی ہو سکتا تھا۔ اور وہ برطرف بھی کیا جاتا تھا[٣]۔ اضلاع کے قاضیوں کا انتخاب قاضی صوبہ ہی کرتا اور گورنر کے پاس ان کے تقرر کی سفارش ہوتی تھی[٤]۔ صوبے کے قاضی ترقی کر کے قاضی القضاۃ کی خدمت پر فائز ہو سکتے تھے[٥]۔

دیگر عہدہ دار جو قاضی صوبہ کے ماتحت تھے، مفتی، محتسب، پنڈت اور داد بک ہوتے[٦]۔ دیوان صوبہ[٧] مالیہ[٨] اور مالگزاری کا عہدہ دار تھا۔ اور اس کے فیصلوں کے خلاف گورنر یا سلطان کے پاس مرافعہ ہوتا تھا۔ صدر صوبہ[٩] صوبوں میں صدر جہاں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اور

---

١ بشیر احمد ص ۱۱۸
٢ برنی ص ۳۵۲
٣ قاضی تاج الدین کو اودھ کی قضاء سے معزول کیا گیا۔ ملاحظہ ہو برنی ص ۴۳۴ قاضی جلال کاشانی کو بدایون کی قضاء پر منتقل کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو الیٹ جلد ۳ ص ۱۴۵
٤ بشیر احمد ص ۱۱۹
٥ عباسی خلافت کا بھی یہی طریقہ عمل تھا۔ ملاحظہ ہو امیر علی شارٹ ہسٹری حوالہ صدر ص ۱۱۸
٦ بشیر احمد ص ۱۱۹
٧ " ص ۱۲۰
٨ فینانس ۔
٩ بشیر احمد ص ۱۲۰

Marfat.com

محکمہ امور مذہبی اس سے متعلق تھا۔ ایسے انتظامی معاملات جو قاضی سے غیر متعلق رکھے گئے تھے۔
صدر صوبہ کے پاس آتے۔

(۳) ضلع یا سرکار کی عدالتیں[1]

عہدہ دار عدالت	اختیار سماعت
(۱) قاضی	(۱) تمام قسم کے دیوانی اور فوج داری مقدمے
	(۲) پرگنہ کے (الف) فاجنوں (ب) کوتوالوں اور (ج) دیہی پنچایتوں کے فیصلوں کے مرافعے۔
(۲) داروغہ	معمولی قسم کے دیوانی مقدمے۔ مرافعہ قاضی صوبہ کے پاس ہوتا۔
(۳) فوج دار	معمولی قسم کے فوج داری مقدمے۔ مرافعہ ناظم کے پاس ہوتا۔
(۴) صدر	زمینوں اندراج رجسٹری وغیرہ کے جھگڑے صدر صوبہ کے پاس مرافعہ ہوتا۔
(۵) عامل	مالگزاری کے مقدمات میں دیوان صوبہ کے پاس مرافعہ ہوتا۔
(۶) کوتوال	معمولی قسم کے تعزیری مقدمات پولیس کے متعلقات۔ مرافعوں سے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا

قاضی کو دیوانی اور فوج داری ہر قسم کے مقدموں کی سماعت کا اختیار تھا اور امور واقعاتی اور امور قانونی دونوں میں قاضی کو فیصلے کا اختیار رہتا۔ البتہ امور قانونی میں وہ مفتی کا مشورہ حاصل کرتا تھا۔ تعزیری جرائم میں قاضی سزائے موت بھی دے سکتا تھا[2]۔ قاضی سرکار کے دیگر

---

[1] بشیر احمد ص ۱۲۰-۱۲۱ -
[2] " " ص ۱۲۱ -

Marfat.com

فرائض حسب ذیل تھے :-

۱) شادیوں کا رجسٹر میں اندراج کرنا ۔

۲ ۔ وقف اور امانتوں سے متعلق مقدمات کی سماعت ۔

۳ ۔ لاوارث جائداد، گمشدہ مفقود الخبر اور مجنونوں سے متعلق مقدمات کی سماعت ۔

۴ ۔ جیل خانوں کی نگرانی ۔

دیگر عہدہ داروں میں، جو قاضی سرکار کے ماتحت تھے، مفتی، پنڈت محتسب اور داروغہ شامل ہیں[۲]۔ قاضی سرکار کی عدالت میں حسب ذیل عملہ کام کرتا تھا ۔

۱ ۔ کاتب ۔ جو بیانات اور شہادتیں قلم بند کرتا تھا ۔

۲ ۔ فقیہ ۔ جو فتوے اور نظائر لکھتا تھا ۔

۳ ۔ ناظر ۔ جو عدالت کے تمام انتظامی امور کا ذمہ دار تھا ۔

۴ ۔ ماتحت ۔ منشی

۵ ۔ برقنداز ۔ یعنی چوکیدار اور نگرانی کار ۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے سے اخبار نویس بھی مقرر ہونے لگے اور ان کا کام یہ تھا کہ عدالت کی روزانہ روئیداد لکھا کریں ۔ تاکہ معائنہ کے لئے جو عہدہ دار دورہ کرتے ہیں، ان کے سامنے عدالت کا پورا کام آجائے[۳]۔

سرکار میں فوجدار کو گورنر مقرر کرتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ جن اشخاص پر کسی جرم کا یا کسی اور قسم کا شبہ ہو، اُن کو زیر حراست رکھے ۔ یہ دراصل مقامی فوجوں کی کمان کرتا تھا اور اس کا کام عاملانہ تھا ۔[۴]

---

۱ بشیر احمد ص ۱۲۲

۲ " " "

۳ " " ص ۱۲۳

۴ " " "

Marfat.com

(۴) پرگنے کی عدالتیں[1]

(۱) قاضی پرگنہ . . . . (۱) تمام قسم کے دیوانی و فوجداری مقدمے۔

(۲) مقدمات متعلق امور مذہبی۔

(۴) کوتوال . . . . معمولی قسم کے تعزیری مقدمے۔

قاضی پرگنہ کو قاضی سرکار کے تمام اختیارات حاصل تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا قاضی پرگنہ کو مرافعہ کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ قاضی سرکار کی طرح قاضی پرگنہ کے تحت بھی مفتی اور محتسب وغیرہ تھے۔ پرگنوں میں کوئی فوجدار نہ تھا۔ سب سے بڑا عاملہ کا عہدہ دار کوتوال تھا۔ اور یہ معمولی قسم کے تعزیری مقدموں کی سماعت بھی کرتا تھا۔

(۵) دیہات کی عدالت

دیہات میں پنچایت دیہی عدالت کا کام دیتی تھی اور اس کا سرپنچ ناظم یا فوجدار کی طرف سے مامور ہوتا تھا۔ مقامی نوعیت کے تمام ابتدائی اور فوجداری مقدمات پنچایت کے سامنے آتے تھے[2]۔

(۶) فوج کی عدالتیں

ہر فوجی چھاؤنی کے لئے قاضی اردو یا قاضی عسکر مقرر ہوتا تھا اور فوجی چھاؤنی کی حد تک اسے پورا اختیار حاصل تھا۔ اس قاضی کے اختیارات وہی ہوتے جو قاضی پرگنہ کو حاصل تھے[3]۔ نیز فوجی چھاؤنیوں میں قاضی کے علاوہ امیر داد کے نائب بھی مقرر ہوتے تھے[4]۔

دہلی کے نظام عدل گستری کی خصوصیتیں

سلطنت دہلی کے نظام عدل گستری کے اس مطالعہ کے بعد اس نظام کی بعض خصوصیتیں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دہلی کے بہت سے ادارے بغداد کے اداروں سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ سلاطین دہلی نے غزنویوں اور حکمران کے توسط سے سندھ کی عرب حکومت نیز سامانیوں وغیرہ کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا اور براہ راست خلافت بغداد سے

۱۔ بشیر احمد ص ۱۲۴۔

۲۔ " ص ۱۲۴-۱۲۵۔

۳۔ بشیر احمد ص ۱۲۵۔

۴۔ برنی ص ۵۸، ۳۶۔ نیز دیکھئے قریشی ص ۱۵۳۔۔

Marfat.com

بھی متاثر ہوئے اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سلاطین دہلی کو تمام بنے بنائے ادارے مل گئے اور سلاطین کو ان میں کچھ اضافہ کرنا نہیں پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سلاطین نے بغداد وغیرہ سے اداروں کے اسلوب تو ضرور لئے۔ لیکن ان کو جوں کا توں نہیں رکھا۔ بلکہ ان کو ہندوستانی ماحول میں ضروریات کے مطابق ڈھال دیا۔ (درسیح تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ دنیا کی اکثر حکومتیں نظم ونسق میں ناکام تھیں اور انتشار پھیلا ہوا تھا، ان سلاطین نے بڑی کامیابی سے ایک بہترین نظم ونسق قایم کیا اور پھر اسلامی عدل گستری کے ادارے میں جو ان کو باہر سے ملا تھا بہت سے اضافے کئے۔

خصوصیتیں

(۱) ایسے لوگوں کے لئے جو خلاف اخلاق اور خلاف شرع زندگی گذارتے تھے، محتسب مقرر کئے گئے اور ان کے فرائض اتنے وسیع تھے کہ افراد مملکت کی خانگی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھے۔

(۲) قاضی اور مملکت کے دیگر عہدہ دار محض سرکاری ملازمت کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر اور خدا سے ڈر کر نظم ونسق میں حصہ لیتے تھے۔

(۳) دیہی پنچایتوں کو سلاطین نے قایم رکھا اور قدیم دیہی نظم ونسق سے پورا فائدہ اٹھایا۔

(۴) محمد تغلق کے زمانے میں ایک نیا محکمہ "دیوان سیاست" بنایا گیا جو سنگین جرائم کی سزائیں دیتا تھا۔

(۵) فیروز تغلق نے تعزیری سزاؤں میں جو حسب شرع مقرر تھیں، ترمیم کی اور ایک نئے ضابطۂ قانون کی بناء ڈالی[1]

(۶) عدالتوں کی کارروائیوں سے واقف ہونے اور عدالتوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے سلاطین عدالتوں سے باخبر رہتے تھے اور اخبار نویس عدالتوں کی روزانہ روئداد لکھ کر سلطان کو عدالتوں سے باخبر رکھتے تھے۔

(۷) ہندوؤں سے متعلق دیوانی مقدموں میں پنڈتوں سے کام لیا جاتا

---

[1] بشیر احمد ص ۱۲۷

تھا۔ بغداد میں غیر مسلموں کے معاملات میں بھی یہی طریقہ عمل تھا۔[۱]

(۸) ایسے قاضی جو نا اہل یا بدکردار ثابت ہوئے، خدمت سے الگ کر دیئے گئے۔

(۹) وزیر یا وزیر اعظم کو خاص مقدموں میں اختیار سماعت حاصل تھا۔[۲] بغداد میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔[۳]

(۱۰) سلاطین دہلی نے ہندوستان کے قدیم نظم ونسق سے بھی فائدہ اٹھایا۔

(۱۱) سلاطین نے رسم و رواج کو بھی نظام عدل گستری میں جگہ دی، جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی رسوم مسلمانوں کی زندگیوں پر قابل لحاظ اثر کرنے لگے۔

(۱۲) عدلیہ کو عاملہ سے حتی الامکان علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی

۱۔ امیر علی شارٹ ہسٹری ص ۱۸۶، ۲۲۴۔

۲۔ سلطنت بنام خواجہ احمد وغیرہ۔ شمس سراج عفیف ص ۵۰۸ وغیرہ

۳۔ بشیر احمد ص ۱۲۵۔

دکن کی سرزمین

ہندوستان کے عین وسط میں کوہ بندھیاچل اور ست پڑا کے سلسلے ہندوستان کو دو طبعی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور ان پہاڑوں کے ساتھ ساتھ نربدا اور تاپتی جیسے دو بڑے دریا بھی ہیں، جن سے یہ تقسیم اور زیادہ واضح ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اس قدرتی تقسیم سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے دو بڑے خطے اپنے قدرتی اور جغرافی حدود کے ساتھ ساتھ الگ ہو جاتے ہیں۔ جنوب کی طرف آئیں تو بائیں گھاٹ کے نیچے ایک سطح مرتفع نظر آتی ہے جو مغربی گھاٹ سے مشرقی گھاٹ کی طرف جھکتی چلی گئی ہے۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۵۰ فٹ اوسطاً بلند ہے۔ اور یہی وہ حصہ ہے، جس کو ہم دکن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو خطۂ ملک آج کل دکن کہلاتا ہے، وہ سرزمین ہے جو بندھیاچل اور نربدا یا تاپتی کے جنوب سے دریائے تنگ بھدرا یا زیادہ سے زیادہ دریائے کاویری تک اور مغربی اور مشرقی گھاٹوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ تنگ بھدرا کے شمال و جنوب میں کرناٹک واقع ہے اور جنوبی کرناٹک بھی روایتاً دکن میں شامل ہے۔

شمالی ہند اور دکن کے جغرافیہ کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو زمین کی اونچ نیچ، پہاڑوں کے موقع محل، دریاؤں کے بہاؤ اور آب و ہوا کے لحاظ سے دونوں میں بین فرق نظر آئے گا۔ اس جغرافی اختلاف کے علاوہ شمالی اور دکن میں نسل، زبان، معاشرت اور تمدن کے اختلافات بھی ہیں اور سچ پوچھیے تو بندھیاچل سے نیچے کی سرزمین ایک جداگانہ جغرافی وحدت ہے، جو مختلف قوموں کا گہوارہ رہی ہے۔

Marfat.com

دکن کی تاریخ کا قدیم دَور

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریکی میں ہے اور یہ دقت ہر ملک کی قدیم تاریخ کے مطالعہ میں پیش آتی ہے۔ تاہم بعض تاریخی شواہد سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس سرزمین پر بے شمار خاندانوں نے حکومت کی اور دکن کا قدیم زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ دراوڑی قوموں نے یہاں جنم لیا۔ (۱) اور یہ زمانہ آریوں کے ہندوستان آنے سے کئی ہزار برس پہلے کا ہے۔ حالیہ تحقیقات خاص طور پر وادیٔ سندھ کی کھدائیوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان دراوڑیوں نے خود بدیشی آریوں کو تہذیب اور تمدن کے سبق دیئے تھے۔

جنوبی ہند کو چھوڑ کر صرف دکن کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہاں تین چار بڑے خاندان ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ساتواہن خاندان ہے جو تقریباً ۲۳۶ء میں ختم ہوگیا۔ ساتواہن کے بعد چالوکیہ خاندان تاریخ کے صفحوں پر نظر آتا ہے۔ چالوکیہ سلطنت ۵۵۰ء میں قائم ہوئی تھی اور سچ پوچھئے تو اسی زمانہ سے دکن کی کچھ واضح تاریخ ملتی ہے۔ چالوکیوں کے دو خاندان تھے۔ ایک مشرقی چالوکیہ اور دوسرے مغربی چالوکیہ اور دونوں نے ۷۵۳ء تک راج کیا۔ ۷۵۳ء سے دکن کی حکمرانی راشٹراکٹ خاندان کے حصے میں آئی۔ جس کے تقریباً ۲۰ راجے ۹۷۳ء تک پائے تخت ملکھیڑ سے حکومت کرتے رہے لیکن آخر میں قدیم چالوکی قبیلے نے پھر سر اُٹھایا اور کلیانی کو پائے تخت بنا کر دوبارہ اپنا راج قائم کر دیا۔ چالوکیاں، کلیانی ۱۱۹۰ء تک برسرِ اقتدار رہے اور اس زمانہ تک اُنہوں نے دکن کی بڑی خدمت کی اور جب یہ اتنے کمزور ہو گئے کہ اپنی وسیع سلطنت کو سنبھال نہ سکے تو مختلف صوبہ دار اپنی اپنی جگہ آزاد ہو گئے۔ چنانچہ یادو، کاکتیا اور ہوئی سال خاندانوں نے تین علیحدہ علیحدہ راج دھانیاں قائم کرلیں، اور دکن میں مسلمانوں کی آمد یعنی تقریباً ایک سو سال تک سیاستِ دکن کے ناخدا رہے۔

تاریخ دکن کا وسطی دَور

دکن کی تاریخ کا وسطی دَور تقریباً ۱۳۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسی زمانے میں

۱۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ "مقدمہ تاریخ دکن"۔ حیدرآباد۔ ۱۹۴۰ء۔ صفحہ ۸۔

Marfat.com

خلجیوں نے دکن پر حملے شروع کئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ دکن کے وسطی دور کی ابتداء خلجیوں کے دکن آنے سے ہو جاتی ہے۔ یوں تو تاریخی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ علاء الدین خلجی کے حملوں سے صدیوں پہلے جنوبی ہند میں مسلمان آ چکے تھے۔ اور یہ عرب سیاح، تاجر اور مبلغ ہیں۔ سچ پوچھئے تو جنوب سے عربوں کے پرانے تعلقات ہیں۔ اور عرب تاجروں نے جنوب ہند کو تو اپنا مرکز لیا تھا۔ (۱) چناں چہ جنوب ہند میں قدیم بزرگوں کے، جو عرب سے ہجرت کر کے آئے تھے، نمایاں آثار پائے جاتے ہیں۔ حضرت تمیم انصاریؓ کا مزار کولم (۲) میں، حضرت عکاشہؓ کا مزار بمقام محمود بندر (۳) اور حضرت مالک بن دینارؒ کی مسجد ملابار اب تک موجود ہیں۔ فرانسیسی مولف لبون لکھتا ہے "اپنی سلطنت کے اچھی طرح مستحکم ہوتے ہی انہوں نے اپنے تجارتی تعلقات کو وسعت دی اور بہت جلد ساحل کارومنڈل ملیبار۔ سوماترا۔ جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوب چین تک پہنچ گئے۔" (۴) تحفۃ المجاہدین کے مصنف اور ابن بطوطہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحلوں خصوصاً ساحل بمبئی اور سندھ کے شہروں میں مسلمان عرب تاجر بکثرت آباد تھے۔

تجارت کے سلسلے میں آبادکاری کے علاوہ یہاں عربوں کے حملے بھی ہوئے۔ چنانچہ ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھانہ (بمبئی) اور بھروچ پر، بھر دیبل (قریب کراچی) پر حملے ہوئے۔ عجائب الہند کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ ہندو راجہ مسلمانوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے اور وہ درباری مراسم کی پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ مسلمانوں کے فصلِ خصومات خود ان کے قاضی وغیرہ کیا کرتے تھے۔ نیز تحفۃ المجاہدین میں داعیانِ اسلام کی آمد کا حال بھی

۱۔ ملاحظہ ہو "سواحلِ ہند پر مسلمانوں کا تو طن"۔ مقالہ مولانا محترم تقی مرحوم مطبوعہ "مجلہ طیلسانین" حیدرآباد، حیدرآباد، جلد ششم شمارہ ۳ و ۴۔ سنہ ۱۳۵۱ فصلی۔ صہ ۲۰ تا ۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو خافی خان منتخب اللباب ج ۳۔ کلکتہ ۱۹۲۵ء۔ صہ ۲ تا ۶۔

۲۔ COVEION مدراس کے جنوب میں ساحل پر تقریباً ۴۰ میل پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ پرتگالی قلعے کے آثار بھی یہاں موجود ہیں۔

۳، ۴۔ انگریزی میں پرتگالی نام سے (PORTO NOVO) لکھتے ہیں۔ حضرت عکاشہؓ کو مقامی مسلمان ہکاس کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقالہ صدؒ "سواحلِ ہند پر مسلمانوں کا تو طن"۔ صہ ۲۲۔

Marfat.com

ملتا ہے جو ملیبار آئے۔ ملیبار کی طرح مشرقی ساحل کارومنڈل میں بھی ان داعیان کے آثار ملتے ہیں۔ ابھی علاءالدین خلجی کی فوجوں کا معبر پر حملہ نہیں ہوا تھا کہ ہمیں ایک مسلمان وزیر ملک اعظم مرزبان الہندی تقی الدین عبدالرحمٰن بن محمد الطیبی کا حال ملتا ہے، جو سندر بندی راجہ (وفات ۶۹۳ھ) کا وزیر تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی مسلمان وزیر ملتے ہیں۔ اور جب علاءالدین خلجی و محمد تغلق نے دکن سے آگے بڑھ کر راس کماری تک تمام ملک فتح کر لیا تو اس وقت ساحلِ ملیبار و کارومنڈل پر مسلمان تاجر موجود تھے۔

علاءالدین خلجی کے حملہ ہائے دکن سے پہلے ساحلی آبادکاروں کے جو حالات دستیاب ہوتے ہیں ان سے یہ بات معلوم کرنی بڑی مشکل ہے کہ آیا ان اولین آبادکاروں نے کبھی دکن کی سرزمین میں بھی نفوذ کیا تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ جنوبی نوآبادکار دکن میں نہیں آئے۔ اور کبھی آئے بھی تو ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ دکن میں جو سیاسی اور عدلیاتی ادارت کی درآمد ہوئی وہ صرف دہلی سے ہوئی ہے۔ جنوبی راستہ سے مطلق نہیں ہوئی

دکن پر خلجیوں کے حملے اور تغلقوں کی حکومت

تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دکن اور جنوبی ہند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے تھے۔ ہر حکمران خاندان اپنی برتری کے لئے کوشاں تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہاں خانہ جنگیوں کا بازار گرم رہتا۔ یہ سلطنتیں کافی مالدار تھیں۔ علاءالدین [illegible] حملہ آور تھا جس نے ۱۲۹۴ء میں دکن کی طرف رخ کیا اور پہلے دیوگیر [illegible] فتح کر لیا۔(۱) اس کے بعد جب علاءالدین سلطنت دہلی کا مالک ہوا تو اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن پر متعدد حملے کئے جن سے تلنگانہ، کرناٹک اور ساحلی علاقے متاثر ہوئے (۲) لیکن وسائل کی کمی اور دہلی سے دوری کی وجہ سے علاءالدین خلجی نے دکن کی کسی سلطنت

۱- خافی۔ ص۔ یہ ترکی النسل تھے اور آج تک دکنی زبانوں مثلاً تلنگی وغیرہ میں ترک کے معنی مسلمان کے ہیں۔

۲- امیر خسرو۔ اعجاز خسروی رسالہ اوّل۔ نولکشور، کانپور ۱۸۶۵ء، ص ۱۸۔ عصامی فتوح السلاطین، [illegible] مرتبہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین۔ آگرہ ۱۹۳۸ء، ص ۲۶۴، ۲۶۲، ۲۷۴، ۲۸۱، ۲۶۵، ۲۶۷۔

Marfat.com

سا الحاق نہیں کیا۔ ان کو صرف باجگزار بنائے رکھا۔ ان راجاؤں کے ساتھ اچھا سلوک بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۳۰۷ء کے حملے میں رام دیو نے صلح کر لی تو اس کو دہلی میں دعوت دی گئی۔ راجہ نے سلطان کے حضور میں بیش بہا تحائف اور سات سو ہاتھی پیش کئے۔ علاء الدین نے بھی اس کی عزت کی۔ اس کو رائے رایان کا خطاب چتر اور انعامات دیئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رام دیو چھ مہینہ دلی میں رہا اور روزانہ دربار میں حاضر ہو کر اظہار عقیدت کرتا رہا۔ (۱) اور جب واپس ہوا تو زندگی بھر اطاعت گزار رہا۔ (۲) علاء الدین کی اس حکمتِ عملی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دکن اور جنوبی ہند کے اکثر باجگزار راجہ ملک کافور کی مدد کرتے رہے۔

ملک کافور اپنی فاتحانہ شان کے ساتھ دیوگڑھی سے آگے بڑھا اور ورنگل، دوار سمدرا، ملیبار، رامیشورم اور معبر تک فاتحانہ پیش قدمی کرتا گیا۔ غرض علاء الدین خلجی کے زمانہ میں دکن کے تمام راجگان شہنشاہیتِ دہلی کے ماتحت تھے۔ لیکن جب اس نے ۱۳۱۶ء میں وفات پائی اور اس کے دو ہی مہینے بعد ملک کافور مارا گیا تو مرکز میں نہ کوئی قابل حکمران باقی رہا اور نہ کافور جیسا سپہ سالار۔ اس لئے حملوں کا سلسلہ بہت دنوں تک بند رہا۔ علاء الدین خلجی نے دکن کی تمام ریاستوں کو صرف خراج گزار ہونے پر مجبور کیا تھا، اور ان سے صرف اپنی سیادت منوائی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں دشوار گزار فاصلوں کا طے کرنا آسان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ایلچ پور کی چھاؤنی کے سوا دکن میں ابھی تک مسلمانوں کی کوئی قابلِ لحاظ آبادی نہ تھی۔ لیکن قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں جو ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، یہ مسلک بالکل بدل گیا۔ اس زمانے میں دیوگیری کے راجہ ہرپال نے خراج دینے سے انکار کر دیا تو اس کے ساتھ مہاراشٹر کے بہت سے رئیس شریک ہو گئے۔ سلطان نے خود فوج کشی کی۔ (۳) باغی راجہ مارا گیا اور اس طرح ۱۳۱۷ء سے دیوگیری کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان نے شمالی دکن میں اپنے وزیر، صوبہ دار اور دوسرے

۱۔ امیر خسرو۔ خزائن الفتوح۔ علی گڑھ۔ ۱۹۲۷ء۔ صـ ۷۳۔

۲۔ برنی۔ صـ ۳۲۶۔ خزائن الفتوح۔ محولہ صدر، صـ ۶۹ تا ۷۱۔

۳۔ عصامی۔ صـ ۳۵۲ تا ۳۵۹ ۔ برنی۔ صـ ۳۸۹، ۳۹۰۔

فرشتہ۔ صـ ۱۲۵۔

Marfat.com

عہدہ دار مقرر کر دیئے۔ (۱) اور امراء کو دکن میں جاگیریں دیں۔ (۲) مبارک شاہ کے جنرل خسرو خان نے جنوبی ہند پر حملے کئے اور مالِ غنیمت وصول کیا۔ (۳)

۱۳۲۰ء میں خلجیوں کے خاتمہ کے بعد جب تغلق برسرِ حکومت ہوئے تو ان لوگوں نے بھی مبارک شاہ کا الحاقی مسلک اختیار کیا۔ ۱۳۲۱ء میں شہزادہ جونا کو جو بعد میں محمد تغلق کے نام سے بادشاہ ہوا، ورنگل بھیجا گیا۔ یہ حملہ بعض اسباب سے ناکام رہا۔ مگر دوسرے سال بھی جونا دوبارہ دکن آیا اور اُس نے بیدر و ورنگل کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ راجہ پرتاب رودرا دیو ثانی جسے مسلمان مورخ لدر دیو لکھتے ہیں اور اس کے سردار مال غنیمت کے ساتھ دہلی بھیجے گئے۔ (۴) شہزادہ جونا نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں حکام اور عہدہ دار مقرر کئے اور ملک میں نیا نظم و نسق قائم کر دیا۔ ورنگل کا نام سلطان پور رکھا گیا۔ مبارک شاہ نے مہاراشٹر کا الحاق کیا تھا اور اب تلنگانہ سلطنت دہلی کا ایک جزو بن گیا۔ ۱۳۲۳ء

یہی فاتح ورنگل جونا سلطان محمد تغلق کے لقب سے ۱۳۲۵ء میں ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ یہ معرکۃ الآرا عہد ہے، جس میں ملکی خوش حالی اور وسعتِ سلطنت کے متعلق بہت سے منصوبے سوچے گئے جو بدقسمتی سے سب ناکام ہوئے۔ (۵) انہی میں دکن میں اسلامی آبادکاری کا ایک بہت بڑا منصوبہ بھی تھا۔ سلطان کا خیال تھا کہ جب تک اس خاص امر میں اہتمام نہ کیا جائے، شمالی ہند کے مسلمان یہاں کس طرح بس سکتے ہیں۔ اور دکن اور جنوب ہند

۱۔ عصامی۔ ص ۳۵۵ - ۳۵۸۔

۲ - ایضاً - فرشتہ، ص ۱۲۵۔ نیز ملاحظہ ہو مرقع کرناٹک مؤلفہ عبدالرحیم خان (طبع علیگڑھ دکن) ۱۳۲۲ھ۔

۳ - عصامی، ص ۳۵۹ - ۳۶۲ - برنی، ص ۳۹۸ - فرشتہ، ص ۱۲۵۔

۴ - بشیرالدین احمد نے لکھا ہے کہ "چند روز کے بعد رودر دیو کو ورنگل آنے کی اجازت مل گئی۔ اور وہ مرتے دم تک بادشاہ کا مطیع و فرمان بردار رہا۔ وہ ۱۳۲۵ھ میں مرا۔ بشیرالدین احمد۔ تاریخ بیجاپور، مطبع مفید عام۔ آگرہ۔ ۱۹۱۱ء۔ ص ۲۰۔

۵۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو THE RISE AND FALL OF MUHAMMAD BIN TUGHLUG BY DR. MAHDI HUSAIN, (LONDON, 1938)

Marfat.com

دور دراز اقطاع پر کیوں کر حکومت ہو سکتی ہے ؟۔ اسی بنا پر اس نے دیوگیری کو دولت آباد کے نام سے اپنا ایک جنوبی پائے تخت بنانے کی کوشش کی تھی۔ دہلی سے ایک بڑی جماعت ۱۳۲۷ء میں دولت آباد گئی۔ ان نو آبادکاروں میں سب سے پہلے سلطان کی والدہ مخدومہ جہاں تھیں۔ جن کے ہمراہ متعلقین، ملازمین، علماء اور درویشوں کا بڑا حاشیہ تھا۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا تو آج شمال اور جنوب کی تاریخ دوسری ہوتی۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوا۔ دولت آباد کی مرکزی حکومت اور آبادی پھر شمال میں منتقل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت کمزور ہو گئی۔ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی، کیونکہ سلطنت دہلی کے حدود مدورا تک پہنچ گئے تھے اور دہلی سے اس قدر وسیع سلطنت کی دیکھ بھال بہت مشکل تھی۔ خود سلطان محمد تغلق بھی ان ذمہ داریوں کا اہل نہ تھا۔ اس سے ایسی انتظامی کوتاہیاں سرزد ہوئیں کہ سلطنت میں رخنے پڑ گئے اور بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔

دکن کی خود مختاری اور امیرانِ صدہ

۱۳۲۸ء سے ہی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تلنگانہ اور کرناٹک میں ہندو طاقتوں نے سر اٹھایا۔ ۱۳۴۴ء میں مدورا کا گورنر جلال الدین احسن شاہ خود مختار ہو گیا۔ اس کے پانچ چھ سال کے بعد مالوے اور گجرات کے "امیرانِ صدہ" میں ہلچل شروع ہو گئی۔ چند سال کے بعد دکن کے "امیرانِ صدہ" بھی آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ یہ ترک افسر تھے جو خلجیوں کے زمانے سے جنوبی خطوں کی دیکھ بھال کے لئے مامور تھے۔ تغلقوں کے زمانے میں ان میں اور اضافہ ہوا اور بے شمار ترک گھرانے دکن کے طول و عرض میں آباد ہو گئے۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ برنی۔ ص ۵۱۰ تا ۵۲۴۔ عصامی۔ ص ۴۹۱۔ فرشتہ۔ گلشنِ ابراہیمی جلد ۱۔ نولکشور کانپور ۱۸۷۴ء۔ ص ۱۴۱-۱۴۲۔ ملکاپوری۔ محبوب التواریخ۔ حیدرآباد دکن ۱۳۳۱ھ ص ۳۹-۴۲-۵۸۔ نیز ملاحظہ ہو، پروفیسر عبدالمجید صدیقی :۔

MALIK SAIFUDDIN GORI, (PROCEEDINGS IND. HIST CONGRESS, 1939, CALCUTTA, PP. 702-704.)

Marfat.com

سو سو موضعوں کے حلقے ان امیروں کے سپرد تھے۔ ان کا فرض تھا کہ یہ اپنے اپنے حلقوں میں امن قائم رکھیں اور مال گزاری وصول کریں۔ یہ مرکزی حکومت کی فوجی ضرورت بھی پوری کرتے تھے۔ سو موضعوں کی وجہ سے ان حلقوں کو "صدی" کہتے تھے۔ اور امیروں کو "امیرانِ صدہ"۔ یہی امیرانِ صدہ وسطی دکن کی تاریخ ساز ہیں۔ انہی لوگوں نے دکن کی سیاسی اور تمدنی خدمت کی اور وسطی دکن کی تمام تاریخ بنائی۔ انہی کے سیاسی و عدلیاتی تصورات سے سلطنتِ دکن کی تعمیر بھی ہوئی۔

امیرانِ صدہ کی اصل تاریخ ۱۳۴۰ء یا ۱۳۴۲ء سے شروع ہوتی ہے، جب کہ ان کے اور بادشاہ کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی۔ سلطان محمد تغلق اس طبقے سے بہت ناراض ہو گیا اور بغاوت اور بے چینی کا انہیں ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے ایک اور انتظامی غلطی یہ کی قتلغ خان جیسے ہر دل عزیز صوبہ دار دکن کو دولت آباد سے معزول کر کے اس کی جگہ اس کے بھائی نظام الدین کو مقرر کیا جسے حکومت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس انتظام سے رہا سہا اثر بھی جاتا رہا۔ اور بغاوتیں ہونے لگیں۔ پھر مالوے میں جو دکن کے ساتھ شامل تھا "عزیز خمار" نامی ایک نیچ ذات نومسلم کو مقرر کیا جو بہت بدنام تھا۔ عزیز خمار کو ہدایت تھی کہ وہ امیرانِ صدہ کے خلاف سخت تعزیری تدبیریں اختیار کرے۔ چنانچہ عزیز نے مالوے کے مرکز دھار میں آتے ہی ۸۹ امیرانِ صدہ کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گجرات اور دکن کے امراء میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ پہلے گجرات کے اُمراء نے بغاوت کر دی۔ جسے فرو کرنے کے لئے ۱۳۴۵ء میں خود سلطان کو آنا پڑا۔ یہ بغاوت ایک حد تک فرو ہو گئی لیکن بھڑوچ میں بیٹھ کر سلطان نے دولت آباد سے بھی امیرانِ صدہ کو طلب کیا اور نظام الدین نے دکن کے امراء کو جمع کر کے شاہی حکم سنایا اور ملک احمد لاچین اور ملک علی کی نگرانی میں ان کو بھڑوچ روانہ کر دیا۔ لیکن یہ لوگ ایک منزل سے آگے نہیں گئے بلکہ بادشاہ کے روئے سے ڈر کر ہمہ دولت آباد لوٹ گئے۔ اور دولت آباد میں نظام الدین کو قید کر کے خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ اپنی رہنمائی کے لئے ایک تجربہ کار امیر صدہ اسمٰعیل مخ کو ناصر الدین شاہ کے لقب سے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ جدید انتظام کے لئے عہدہ دار مقرر کئے اور جاگیریں تقسیم کیں۔ (۱۳۴۵ء)۔

Marfat.com

سلطان کے لئے دکن کی بغاوت سب سے زیادہ روح فرسا ثابت ہوئی کیوں کہ دکن سے اس کو دلی تعلق تھا۔ وہ گجرات سے فوراً دکن کی بغاوت فرو کرنے کے لئے آگیا۔ قلعہ دولت آباد کے سامنے لڑائی ہوئی۔ اس میں امیرانِ صدہ ہار گئے اور قلعہ میں محصور ہو گئے۔ بادشاہ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کو بہت جلد گجرات جانا پڑا کیوں کہ گجرات میں ایک اور بغاوت کھڑی ہو گئی تھی۔ سلطان کی دوسری فوج نے باغیوں کے ساتھ بیدر کے قریب شکست کھائی، جس میں تغلقی سپہ سالار عماد الملک مارا گیا۔ اس شکست سے دولت آباد کے محاصرین بھی بھاگ کھڑے ہوئے اور دکن ہمیشہ کے لئے دہلی سے آزاد ہو گیا۔ (۱)

بہمنی سلطنت

اس پُر آشوب زمانے میں جب کہ سلطان محمد سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اسمٰعیل مخ ہی اہلِ دکن کی رہبری کرتا رہا۔ (۲) لیکن جدید سلطنت کے لئے جو اب صورت گیر ہو رہی تھی، ظفر خان جیسے جوان مرد کی ضرورت تھی۔ ظفر خان، جس کا نام حسن ہے، ایک سربرآوردہ امیر صدہ تھا۔ ان باغیانہ سرگرمیوں میں جو سلطان محمد کے خلاف ہوئی تھیں، ظفر خان کا بڑا حصہ ہے۔ سب امیروں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ اور اگر عصامی (۳) کا خیال صحیح سمجھا جائے تو خود ناصر الدین شاہ اسمٰعیل مخ بھی ظفر خان کا قائل تھا اور اپنے کو ظفر خان کا نائب سمجھتا تھا۔ اسماعیل بڈھا تھا اور ظفر خان جوان۔ تمام اُمرا نے اس سے اتفاق کیا اور حسن نے علاء الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے ۱۳۴۷ء میں دکن کی نئی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور گلبرگہ کو احسن آباد کے نام سے سلطنتِ دکن کا پایۂ تخت بنایا۔

۱۔ برگس۔ ہسٹری آف دی رائز آف محمڈن پاور اِن انڈیا۔ کلکتہ۔ ۱۹۰۸ء۔ صہ ۴۲۶-۴۲۷، ۴۳۲-۴۳۳-۲۸۵-۲۹۱۔ برگس۔ جلد ۲ صہ ۲۹۱-۲۹۲۔

۲۔ خافی۔ صہ ۱۲۔ عصامی۔ صہ ۴۹۱۔ فرشتہ۔ صہ ۲۷۵۔

۳۔ عصامی۔ صہ ۵۲۳۔

Marfat.com

بہمنی سلطنت (۱) دکن کی ترقی کے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اور بعض مورخ تو اسی زمانے سے دکن کا وسطی دور شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت دکن آزاد ہوا، اور اس میں مرکزیت آگئی۔ علاء الدین بہمن شاہ نے اپنی گیارہ سالہ حکومت میں اس نوخیز سلطنت کی تشکیل کی (۲) دکن پر حملہ کر کے مغرب میں گوا تک اور مشرق میں بھونگیر تک اپنے حدود سلطنت وسیع کر لیے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت بہمنی کے حدود شمال میں خاندیس و مالوہ تک پہنچ گئے تو جنوب میں تنگ بھدرا تک۔ اندرونی نظم و نسق کے لئے سلطنت کے چار صوبے بنائے گئے جو طرف کہلاتے تھے۔ ان پر چار طرف دار مقرر ہوئے۔ ملک سیف الدین غوری (۳) جو اس سلطنت کا وزیر اعظم تھا، اس نئے انتظام اور نظم و نسق کا روح رواں ہے۔ علاء الدین حسن نے ۱۳۵۸ء میں انتقال کیا اور اس کا بیٹا محمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔ (۴) جو اس خاندان کا بڑا تاجدار ہے۔ اس کے عہد میں راجگان ورنگل اور وجیانگر کے ساتھ خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ اس کا اصلی کام نظم و نسق کی ترتیب ہے۔ محمد شاہ نے مرکزی اور مقامی حکومتوں کو مرتب کیا اور ان میں بڑا سلیقہ پیدا کیا۔ مرکزی حکومت میں آٹھ وزراء مقرر کئے۔ بڑے سلیقے سے ان کے فرائض کی تقسیم کی اور دربار شاہی کی شان و شوکت میں بڑا اہتمام کیا گیا۔ (۵) جس سے

۱۔ بہمنی سلطنت کے اجمالی تذکرے اور سلاطین کے شجرے کے لئے ملاحظہ ہو، پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ حیدرآباد۔ ۱۹۴۰ء۔ ص ۴۵ تا ۷۵۔ نیز بہمنی سلطنت از ... مذکور مطبع طارق۔ حیدرآباد۔ ۱۹۴۸ء

۲۔ خافی خان۔ منتخب اللباب ج ۳۔ کلکتہ ۱۹۲۵ء۔ ص ۱۵۔

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عصامی۔ فتوح السلاطین۔ مرتبہ ڈاکٹر مہدی حسین۔ آگرہ۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۵۲۵ تا ۵۶۷۔ فرشتہ۔ گلشن ابراہیمی ج۱۔ نولکشور کانپور۔ ۱۸۷۴ء ص ۲۷۳ تا ۲۸۲۔ علی بن عزیز اللہ طباطبا۔ برہان مآثر۔ ۱۰۰۰ھ مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد ۱۹۳۶ء ص ۱۱ تا ۳۱۔ نیز ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ ملک سیف الدین غوری (مقالہ) ص ۱۰۷ تا ۱۱۲۔

۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو برہان ص ۳۱ تا ۴۳۔ فرشتہ ص ۲۸۲ تا ۲۹۵۔ سید اسد اللہ۔ مختار الاخبار، حیدرآباد۔ ۱۲۹۴ھ ص ۱۶ تا ۲۵۔

۵۔ عبدالجبار خان ملکاپوری محبوب التواریخ۔ حسن پریس۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۳۳۱ھ۔ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵۔

Marfat.com

محمد شاہ کی بلند خیالی اور دستور ساز ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن جب محمد شاہ کا ۱۳۷۷ء میں انتقال ہوگیا تو سلطنت کی ترقی بہت دنوں تک رکی رہی۔ اس کے بیٹے مجاہد شاہ (۱) کو تین سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اس کے چچا داؤد شاہ نے اسے قتل کرکے تخت پر قبضہ کرلیا۔ ایک ہی مہینہ میں داؤد شاہ (۲) کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور محمد شاہ دوم (۳) کو جو علاء الدین حسن کا پوتا تھا، تخت نشین کیا گیا۔ (۱۳۷۸ء)

محمد شاہ ثانی کے زمانہ میں سلطنت خوش حال تھی اور رعایا چین کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس زمانے میں میر فضل اللہ انجو جیسے علماء ملک میں جج تھے۔ ۱۳۹۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اس کے دو بیٹے غیاث الدین اور شمس الدین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے (۴) لیکن یہ دونوں تغلچین نامی ایک بے وفا ترک غلام کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھے۔ تغلچین نے سلطنت کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس کی وجہ سے ملک میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔ بالآخر محمد شاہ ثانی کے چچازاد بھائی فیروز خان نے طاقت فراہم کی اور تغلچین کو قتل کرکے تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے ۱۳۹۷ء میں تخت فیروزہ پر قبضہ کرلیا۔

فیروز شاہ کا عہد حکومت بہمنی سلطنت کا معراج ہے۔ اس نے ملک کے نظم و نسق کے لئے لائق ارباب سیاست مقرر کئے۔ اپنے بھائی احمد خان کو خان خانان اور امیر الامراء بنایا۔ اور میر فضل اللہ انجو کو وکیل مطلق کی بلند خدمت پر مامور کیا۔ ہندو بھی حکومت میں شریک تھے۔ اس عہد کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں زبردست علمی سرگرمیاں ہوئیں۔ بڑے لائق علماء جمع کئے گئے۔ اور علم کی اس قدر گرم بازاری تھی کہ گلبرگہ دنیا کا بڑا علمی مرکز ہوگیا تھا۔ خود فیروز شاہ اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا۔ لیکن ۱۴۲۲ء میں اس کے بھائی احمد خان نے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو برہان صـ ۳۴ تا ۳۶۔ فرشتہ۔ صـ ۲۹۵ تا ۳۰۰۔

۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 صـ ۳۶۔ فرشتہ۔ صـ ۳۰۰ تا ۳۰۱۔ خافی صـ ۳۹۔۴۰۔

۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 صـ ۳۶ تا ۳۸۔ فرشتہ، صـ ۳۰۱ تا ۳۰۳۔ فرشتہ نے غلطی سے محمود شاہ نام لکھا ہے۔

۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 فرشتہ، صـ ۳۰۴ تا ۳۰۶۔ برہان صـ ۳۸ تا ۴۱۔ خافی۔ صـ ۴۲۔۴۹۔

Marfat.com

اسے قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

احمد خان کے عہد حکومت سے جو احمد شاہ ولی بہمنیؒ کے نام سے مشہور ہے، بہمنی سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں مزید کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ خود احمد شاہ کے عہد سے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ احمد شاہ نے ورنگل کے ہندو راج کو بالکل ختم کر دیا۔ اور مغرب میں کوکن بہمنی اقتدار کے بالکلیہ تابع کیا گیا۔ احمد شاہ کے عہد میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ تقریباً ۱۴۳۱ء میں گلبرگہ کی بجائے بیدر پایۂ تخت بنایا گیا۔ لیکن ایک خرابی یہ ہوئی کہ بہمنی سیاست میں باہر والوں کا عمل دخل بڑھتا گیا، جس سے اہلِ دکن ناراض ہونے لگے۔ علاء الدین ثانی کے عہد میں جو احمد شاہ کے بعد ۱۴۳۴ء میں تخت نشین ہوا تھا، یہ کش مکش زیادہ سخت ہو گئی۔ چنانچہ علاء الدین کا زمانہ اسی کش مکش کی داستان ہے۔ اس کے بعد ۱۴۵۸ء میں اس کا بیٹا ہمایوں ظالم (۱) تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کا عہد تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اس کے مرنے کے بعد ۱۴۶۱ء میں اس کا بڑا بیٹا نظام شاہ (۲) تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ دو سال کے بعد مر گیا تو ۱۴۶۳ء میں اس کا چھوٹا بھائی محمد شاہ لشکری (۳) تخت نشین ہوا۔ جب تک یہ کم سن تھا اس کی ماں مخدومہ جہاں نے امور سلطنت انجام دیئے۔ اور جب محمد شاہ نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ یہ اچھا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے عہد میں سلطنت بہمنی مشرق و مغرب میں قدرتی حدود تک پہنچ گئی۔ مشرق میں مسولی پٹم اور اڈریسہ تک اس کے حدود پہنچ گئے تو مغرب میں گوا تک۔ چنانچہ اس وسیع سلطنت کے اب آٹھ صوبے بنانے پڑے۔ محمود گاوان (۴) اس زمانے کا مشہور وزیر ہے جس نے نظم و نسق کے ساتھ ملک کی علمی خدمت

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ فرشتہ ص ۲۳۹ تا ۲۴۳۔ برہان ص ۸۸ تا ۹۶۔ خافی ص ۸۷۔ ۹۳۔

۲۔ " " " ۲۴۳ تا ۲۴۷۔ " " ۹۶ تا ۱۰۷۔ " " ۹۳۔ ۱۰۱۔

۳۔ " " " ۲۴۷ تا ۲۶۱۔ " " ۱۰۷ تا ۱۳۴۔ " " ۱۰۲۔ ۱۱۵۔

۴۔ " " " سیرۃ المحمود۔ مؤلفہ عزیز مرزا مرحوم۔ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۷ء

نیز ملاحظہ ہو۔ پروفیسر ہارون خان شیروانی — EARLY MUSLIM POLITICAL THOUGHT (LAHORE '42) P. 232

برہان ص ۱۱۹ تا ۱۳۴۔

Marfat.com

بھی کی۔ لیکن بدقسمتی سے دکنیوں اور غیر دکنیوں کی طبقہ داری کش مکش بھی سخت ہوگئی جس کا محمود گاوان بھی ذمہ دار ہے۔ اہل دکن وزیر کے دشمن ہو گئے اور بالآخر ۱۴۸۱ء میں دھوکہ دے کر اس کو قتل کر دیا۔ اس کے ایک سال بعد خود محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔ محمود گاوان کے قتل کی وجہ سے اس کے ہمدرد آمادۂ بغاوت ہو گئے اور خود محمد شاہ کے عہد میں بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ لیکن جب اس کے بعد ۱۴۸۲ء میں اس کا کم سن بیٹا محمود شاہ (۱) تخت نشین ہوا تو علانیہ بغاوت ہوگئی۔ چنانچہ برار، دولت آباد، بیجاپور کے صوبہ دار آزاد و خود مختار ہو گئے۔ ادھر مرکز میں قاسم برید سر نوبت نے اس قدر سر اٹھایا کہ اس کے جانشین جو "برید" کہلاتے ہیں بالآخر بہمنی مرکز میں صاحب اقتدار ہو گئے۔ محمود شاہ اور اس کے جانشینوں کی ایک نہیں چلتی تھی۔ سب کچھ برید کرتے تھے۔ اس طرح بیدر میں برید خاندان کا راج ہوگیا۔

۱۵۲۶ء تک محمود شاہ کے جانشین احمد شاہ (۲)، علاء الدین ثالث (۳)، ولی اللہ (۴)، کلیم اللہ (۵)۔ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور آخری بادشاہ کلیم اللہ نے تو ۱۵۲۷ء میں بیدر سے بھاگ کر احمد نگر میں پناہ لی تھی۔ اسی زمانے میں شمال میں مغل حملہ کر رہے تھے۔ (۶)

پانچ سلطنتیں

محمود گاوان کے قتل کے بعد سلطنت کا جو شیرازہ بکھرا تو چند سال کے اندر سلطنت بہمنی کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر یہ سلطنت سنبھل نہ سکی۔ اور اس کے کھنڈروں پر پانچ سلطنتیں

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ فرشتہ ص ۳۶۱ تا ۳۷۳۔ برہان ص ۱۲۴ تا ۱۳۰۔ خافی ص ۱۱۶۔ ۱۳۱۔

۲۔ ″ ″ ″ ۔ ″ ″ ۳۷۴۔ خافی ۱۳۲۔ ۱۳۴۔

۳۔ ″ ″ ″ ۔ ″ ″ ۳۷۵۔ ″ ۱۳۳ تا ۱۳۵۔

۴۔ ″ ″ ″ ۔ ″ ″ ″ ۔ ″ ۱۳۶۔

۵۔ ″ ″ ″ ۔ ″ ″ ۳۷۶۔ ″ ۱۳۶۔ ۱۴۰۔

۶۔ ″ ″ ″ ۔ خافی ص ۱۳۷۔

Marfat.com

قائم ہو گئیں۔ جن میں سے بیجاپور (۱)، احمد نگر (۲) اور گولکنڈہ (۳) کی سلطنتیں بہت طویل ہوئیں اور ان کی بڑی تاریخ ہے۔ ان کے علاوہ برار (۴) اور بیدر (۵) کی بھی دو چھوٹی سلطنتیں تھیں۔ مگر ان کی زیادہ تاریخ نہیں ہے۔ یہ چھوٹی سلطنتیں بالآخر احمد نگر اور بیجاپور میں ضم ہو گئیں۔ ان سلطنتوں کا دستور تو وہی تھا جو بہمنوں سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن علوم و فنونِ لطیفہ میں ان سلطنتوں کا بڑا کارنامہ ہے۔

احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت (۶)

نظام شاہی خاندان کے بزرگ نو مسلم برہمن اور پاتھری کے رہنے والے تھے۔ اسی خاندان کا ایک شخص تیما بھٹ تھا جو احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں بیجانگر میں گرفتار ہوا تھا۔ (۷) یہ مسلمان ہوا اور ملک حسن کے نام سے موسوم ہوا۔ بہمنی سلطنت کی متمدن فضا میں اس کی تربیت ہوئی۔ یہ بچپن سے شہزادہ محمد کے ساتھ رہتا تھا۔ جو بعد میں محمد شاہ لشکری کے نام سے بادشاہ ہوا۔ محمد شاہ لشکری کے عہد میں ملک حسن اشرف ہمایوں نظام الملک بحری خطاب کے ساتھ تلنگانہ کا طرفدار ہوا اور خوب ترقی کی۔ اور جب گاوان شہید ہوا تو یہ مدار المہام اور ملک نائب سرلشکر ہو گیا۔ محمود گاوان کے قتل میں اسی کا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے احمد کو نظام الملک کا خطاب دے کر دولت آباد کا صوبہ دار بنایا اور خود دربار میں رہا لیکن محمود شاہ کے زمانے میں یہ بھی دربار کی

۱۔ خاندانِ عادل شاہی کے اجمالی تذکرے اور شجرے کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مقدمہ تاریخ دکن حیدرآباد ۱۹۴۰ء ص ۶۶ تا ۶۹۔
۲۔ " نظام شاہی " " ص ۶۱ تا ۶۴۔
۳۔ " قطب شاہی " " ص ۷۵ تا ۷۸۔
۴۔ " عماد شاہی " " ص ۵۸ تا ۶۰۔
۵۔ " برید شاہی " " ص ۷۰ تا ۷۴۔
۶۔ نظام شاہی خاندان کے شجرے اور اجمالی تذکرے کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ تاریخ دکن محولہ صدر ص ۶۱ تا ۶۶۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو خافی خاں منتخب اللباب ج ۳۔ کلکتہ ۱۹۲۵ء ص ۱۴۰ - ۲۶۶۔
۷۔ خافی، ص ۱۴۰۔ فرشتہ گلشن ابراہیمی ج ۲ نولکشور کانپور ۱۸۷۴ء ص ۹۳۔

Marfat.com

سازش کا شکار ہوگیا۔ جب یہ مرگیا تو اس کا بیٹا احمد نگر میں نظام الملک بحری کے لقب سے خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ (۱) بیدر کی جو فوجیں اس کی سرکوبی کے لئے آئیں تو ان کو نیکا پور کے قریب شکست دی۔ احمد نے اپنی سلطنت کے لئے نیا شہر احمد نگر بسایا جو بقول فرشتہ بغداد و مصر کا ہم پلہ بن گیا۔ (۲) اس خاندان کے گیارہ بادشاہ ۱۶۳۳ء تک حکومت کرتے رہے۔

اگرچہ اس خاندان نے تاریخ و تمدن کی بڑی خدمت کی لیکن اس کے پہلے دور میں مذہبی کش مکش پیدا ہوگئی۔ جب احمد کے بعد اس کا بیٹا برہان نظام شاہ ۱۵۰۹ء میں تخت نشین ہوا تو دربار میں نئے مذہبی عناصر کام کرنے لگے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ برہان نظام شاہ حضرت سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے احمد نگر کے دربار میں مہدوی فرقے کی آؤ بھگت ہونے لگی اور برہان ابتداء میں اسی فرقے کا معتقد تھا (۳) لیکن اس مہدویت کو شیعہ مذہب نے بہت جلد شکست دے دی اور مصر کے شاہ طاہر (۴) کی وجہ سے جو احمد نگر پہنچ چکا تھا دربار میں شیعہ مذہب کو فروغ ہونے لگا اور بالآخر یہی سرکاری مذہب بن گیا۔ (۵) مہدوی مذہب کی طاقت ٹوٹ گئی اور اس کے پیرو احمد نگر سے خارج کر دیئے گئے۔ (۶) جب شہزادہ عبدالقادر تپ محرقہ سے سخت بیمار ہوا اور سرکاری طبیب وغیرہ علاج سے عاجز آ گئے تھے تو ایسے وقت شاہ طاہر نے اپنے اثر سے مذہب اثنا عشری قبول کروا لیا۔ (۷) دوسرے مذاہب سے کش مکش شروع ہوئی۔ برہان نظام شاہ کی اجازت سے چار مذاہب کے علماء کی ایک مجلس قائم ہوئی جس میں ملا پیر محمد افضل خان، ملا داؤد دھلوی وغیرہ شریک تھے۔ یہ باہم مباحثہ کرتے رہے اور چھ مہینے تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۔ خافی۔ ص ۱۴۵۔ فرشتہ۔ ص ۹۳، ۹۴، ۹۶۔

۲۔ فرشتہ۔ ص ۹۸۔ جلد دوم۔

۳۔ خافی۔ ص ۱۶۲۔

۴۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ خافی ص ۱۶۲، ۱۶۹۔ ۱۸۶۔ فرشتہ ص ۱۰۹۔ ۱۱۸۔

۵۔ فرشتہ جلد ۲ ص ۱۰۲۔ خافی، ص ۱۷۶۔ ۱۹۱۔

۶۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خافی ص ۱۷۹۔

۷۔ خافی ص ۱۸۰۔ ۱۸۲۔ فرشتہ ۲ ص ۱۱۲۔ ۱۱۴۔

Marfat.com

شاہ طاہر کی تدبیر سے یہ بحث صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔ بادشاہ نے تین ہزار اشخاص کے ساتھ اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا۔ (۱) خطبہ اور سکہ میں بھی ائمہ اثنا عشری کا نام لیا جانے لگا خلفاء ثلاثہ کے نام خارج کر دیئے گئے۔ اور سفید چتر سبز بنایا گیا۔ (۲) اس پر عوام میں ہلچل شروع ہو گئی اور ایک مرتبہ بارہ ہزار کے ایک مجمع نے مظاہرہ بھی کیا، لیکن اسے منتشر کر دیا گیا۔ (۳) شاہ طاہر نے ایران سے شیعہ مذہب کے لوگ، بلوائے اور ان کو دربار میں جگہ دی۔ اس تبدیلیٔ مذہب سے سنی رؤسا جیسے سلطان محمود گجراتی۔ میراں مبارک شاہ فاروقی۔ ابراہیم عادل شاہ۔ حماد الملک احمد نگر پر حملہ کی تیاری کرنے لگے لیکن برہان نے ہشیاری سے گجرات اور برہان پور کو اپنے موافق بنا لیا۔ (۴)

برہان کے بعد حسین نظام شاہ اوّل ۱۵۵۳ء میں جانشین ہوا۔ (۵) یہ جنگ تالی کوٹ کا نتائج ہے۔ (۶) لیکن جنگ تالیکوٹ کے بعد ہی بہت جلد اس کا انتقال ہو گیا۔ اگر یہ چند سال اور زندہ رہتا تو سلطنت کو بہت فروغ ہوتا کیونکہ وہ دکن کا سورما تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے سلطنت کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بیٹے مرتضیٰ نظام (۷) کے زمانے میں شہنشاہ اکبر کے سیاسی اثرات بڑھنے لگے۔ مرتضیٰ کے بعد ۱۵۹۷ء میں اس کا بیٹا میران حسین تخت پر بیٹھا (۸) یہ دو سال میں مر گیا۔ چونکہ مرتضیٰ کا بھائی برہان ثانی اس وقت اکبر کے دربار میں تھا اس لئے اکابر سلطنت نے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت نشین کر دیا۔ (۹)

۱۔ فرشتہ ۲ صہ ۱۱۴ - ۱۱۵۔

۲۔ خافی۔ صہ ۱۸۱۔ فرشتہ ۲۔ صہ ۱۱۴

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خافی۔ صہ ۱۸۲ - ۱۸۳۔

۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خافی صہ ۱۸۳ - ۱۹۶۔

۵۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو خافی صہ ۱۸۷ - ۱۹۲۔

۶۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خافی صہ ۱۹۵ - ۱۹۶۔ فرشتہ ج ۲ صہ ۱۲۶ - ۱۲۹

۷۔ " " " " ۱۹۶ - ۲۲۴۔

۸۔ " " " " ۲۲۴ - ۲۳۰۔ فرشتہ ج ۲۔ صہ ۱۴۷

۹۔ " " " " ۲۲۷ - ۲۳۶۔ " " " ۱۵۰

Marfat.com

لیکن یہ خبر سُن کر برہان آگرے سے فوراً دکن پہنچ گیا اور اپنے بیٹے کو ہٹا کر خود تخت پر بیٹھ گیا (۱) لیکن اس کے بدنما کردار کی وجہ سے امراء اس سے خوش نہ تھے اور اسی لئے پرتگالیوں کے مقابلے میں انہوں نے پہلوتہی کی۔ لیکن جب ۱۵۹۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا تو احمد نگر کی وہی سہی حالت بھی جاتی رہی۔ اس کے دوسرے بیٹے ابراہیم کو تخت نشین کر دیا گیا (۲) لیکن وہ ایک سال میں مر گیا اور ۱۵۹۵ء میں اس سلطنت کی یہ حالت ہو گئی کہ اس کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ ابراہیم کا ایک شیر خوار بچہ بہادر نظام شاہ رہ گیا تھا۔ ملک میں دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق اس بچے کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا اور دوسرا فریق احمد کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا۔ جسے شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دونوں فریقوں میں سخت کش مکش ہوئی۔ (۳) اسی زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ شاہزادہ مراد کی سرکردگی میں احمد نگر پر ایک بڑی فوج آ گئی (۴) اس وقت اہلِ احمد نگر بہت پریشان ہو گئے۔ مغلوں کی مدافعت کے لئے انہوں نے چاند بی بی کو بیجاپور سے بلایا جو حسین نظام شاہ کی بیٹی تھی۔ اس بیروتن نے بڑی پامردی سے مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جو تاریخ دکن کا نہایت اہم کارنامہ اور دلکش رومان ہے۔ (۵) ۱۵۹۶ء میں مغلوں نے مجبوراً صلح کر لی اور بہادر شاہ کی بادشاہی تسلیم کر لی۔ (۶) لیکن کب تک مغلوں کا ریلا روکا جاتا۔ ۱۶۰۰ء میں پھر احمد نگر کا محاصرہ ہوا۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ مغلوں کی مدافعت نہیں ہو سکتی تو خودکشی کر لی۔ (۷) اور مغل احمد نگر کے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خافی ص ۲۳۲ - ۲۴۳ - فرشتہ ج ۲ ص ۱۵۶۔

۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۴۳ - ۲۵۶۔

۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۴۶ - ۲۵۶ 〃 〃 〃 ۱۵۷ - ۱۶۵۔

۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۴۸ - ۲۶۲۔

۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۴۸ - ۲۶۲ 〃 〃 〃 ۱۵۷ - ۱۶۴۔

۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۵۶ - ۲۶۴۔

۷۔ احمد اللہ قادری، سوانح چاند بی بی۔ طارق پریس حیدرآباد۔ ۱۹۳۰ء — لیکن خافی نے لکھا ہے کہ سردارانِ دکن نے اسے قتل کر دیا ص ۲۶۲۔ فرشتہ نے بھی یہی لکھا ہے ص ۱۶۴۔ فرشتہ ج ۲۔

قلعے میں داخل ہو گئے لیکن اس فتح کے باوجود ابھی نظام شاہی سلطنت کے بہت سے علاقے باقی تھے۔ مغل پوری سلطنت پر قابض نہ ہو سکے۔ چاند بی بی کے مرنے کے بعد اس سلطنت کے حبشی غلام ملک عنبر نے اس سلطنت کی کامیاب رہبری کی اور مغلوں کے سیلاب کو روکا۔ اکبر کے انتقال کے بعد جس نے صرف قلعہ احمد نگر پر قبضہ کیا تھا، شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں احمد نگر کے ختم کرنے کی پوری تیاری ہو چکی تھی لیکن ملک عنبر کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔ ملک عنبر نے نہ صرف احمد نگر کی گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھال لیا بلکہ بیش بہا تمدنی خدمتوں سے اس سلطنت کو سنوارا۔ اورنگ آباد اسی کا بسایا ہوا ہے جس میں تمدنی لوازم جمع کئے گئے تھے۔ اس میں بلند عمارتیں اور شیریں نہریں بنوائیں۔ زمین کی پیمائش کی اوزان اور پیمانے مقرر کئے۔ یہ تمام تمدنی آثار اس وقت تک بھی موجود ہیں۔ سچ پوچھئے تو نظام شاہی سلطنت کا سنہرا زمانہ ملک عنبر کا عہد تھا۔ لیکن ۱۶۲۶ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو یہ سلطنت بہت کمزور ہو گئی اور شاہجہان نے ۱۶۳۳ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۶۳۵ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ البتہ اس سلطنت کے تمدنی نقوش شمالی دکن میں اب تک موجود ہیں۔

برار کی عماد شاہی سلطنت

برار میں جو سلطنت قائم ہوئی، اس کے حکمران ایک نومسلم نسل کے لوگ تھے۔ فتح اللہ عماد الملک جو اس خاندان کا بانی ہے، معمولی درجہ سے ترقی پا کر ۱۴۷۰ء میں برار کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ محمود گاوان کے قتل کے بعد جب اس کے ہمدرد محمد شاہ لشکری سے منحرف ہو گئے تو عماد الملک بھی سرکش ہو گیا اور یوسف عادل خان کی طرح دربار شاہی کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ اور محمد شاہ کے انتقال کے بعد ۱۴۹۰ء میں دوسرے صوبہ داروں کی طرح یہ بھی خود مختار ہو گیا۔ جس علاقہ پر یہ سلطنت قائم ہوئی تھی وہ بہمنی سلطنت کا صوبہ برار تھا۔ محمود گاوان نے اس صوبے کے دو حصے کر دیئے تھے جن میں سے ایک حصہ پر خواجہ سرا خداوند خان حبشی قابض تھا۔ فتح اللہ کے بیٹے علاء الدین عماد شاہ نے امیر علی برید کی مدد سے حملہ کر کے خداوند خان کو نکال کر ۱۵۱۰ء میں پورے برار پر قبضہ کر لیا، اور عماد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ تاہم برار کی سلطنت اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے ہمسایوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۵۲۰ء میں جب برہان نظام شاہ والیٔ احمد نگر نے حملہ کیا تو علاء الدین کو برار چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور اسے بڑی مشکل سے سلطنت واپس ملی۔ ۱۵۶۲ء میں علاء الدین کے بیٹے دریا عماد شاہ کا انتقال ہو گیا تو یہ اور کمزور ہو گئی۔ ایک کم سن لڑکا برہان اس کا

جانشین ہوا۔ اس کی کم سنی کو دیکھ کر اس کا وزیر تغال خان ۱۵۶۴ء میں سلطنت پر قابض ہو گیا لیکن یہ بھی احمد نگر کے حملوں کی تاب نہ لا سکا۔ کبھی اکبر سے اور کبھی بریدیوں سے مدد مانگی لیکن مرتضیٰ نظام شاہ اوّل نے ۱۵۷۴ء میں برار پر قبضہ کر لیا اور عماد شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

بیدر کی برید شاہی سلطنت

اس خاندان کا بانی قاسم برید ایک ترک تھا۔ یہ محمد شاہ لشکری کے زمانے میں ایران سے آیا تھا۔ اُس نے ایک مرہٹہ لڑکی سے شادی کی اور جب محمود گاوان کی وجہ سے بیدر میں طبقہ واری کش مکش شروع ہوئی تو یہ سُنّی مذہب رکھنے کی وجہ سے محمود گاوان کے فرقے میں شریک نہیں ہوا، بلکہ ملک حسن بحری کے ساتھ رہا۔ چنانچہ محمود گاوان کے قتل کے بعد جب ملک حسن ملک نائب ہوا تو یہ کوتوال شہر مقرر ہوا، اور برید الممالک خطاب پایا۔ ملک حسن کے قتل کے بعد ۱۴۹۰ء میں یہ خود ملک نائب بن گیا، پھر اس اقتدار سے فائدہ اُٹھا کر اس نے محمود شاہ بہمنی کو بے دست و پا کر دیا اور بہمنی سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔ (۱۴۸۷ء)

قاسم برید نے ۱۵۰۴ء میں انتقال کیا تو اس کا بیٹا امیر علی برید اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے زیادہ سیاسی آزادی حاصل کی، چنانچہ خود بہمنی بادشاہوں کی بحالی اور برطرفی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بہمنیوں کے آخری تاجدار کلیم اللہ نے بابر بادشاہ سے مدد طلب کی تھی اور جب یہ راز فاش ہو گیا تو کلیم اللہ موت کے ڈر سے ۱۵۲۷ء میں بیجاپور بھاگ گیا۔ اور وہاں سے احمد نگر بھاگ آیا۔ کلیم اللہ کے بھاگنے کے بعد امیر برید نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ خاندان ہمیشہ بین مملکتی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ یہ لوگ اپنے مقابل کی دکنی سلطنتوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے تھے۔ بیجاپور نے اسے کئی دفعہ شکست دی اور بالآخر اس کو بیجاپور کی سیادت ماننی پڑی۔

۱۵۴۲ء میں امیر برید نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا علی برید تخت نشین ہوا۔ اسی نے پہلی دفعہ شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد فرشتہ کی روایت کے مطابق اس کے دو بیٹے ابراہیم برید اور قاسم برید ثانی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور قاسم برید ثانی کے بعد اس کا بیٹا علی برید ثانی اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا امیر برید ثانی تخت پر بیٹھا جو عیش پسند تھا۔ ۱۶۰۹ء میں مرزا علی نامی ایک امیر تخت پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ نے حیدر آباد جا کر پناہ لی۔ بالآخر ۱۶۱۹ء میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بیدر پر قبضہ کر لیا اور برید شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

Marfat.com

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنتِ بیجاپور کا بانی یوسف عادل خان ایک ترک تھا۔ اس کی نشو و نما سادہ میں ہوئی۔ یہ سادہ سے قسمت آزمائی کے لئے بیدر آیا اور محمود گاوان کے حضور میں پہنچا۔ محمود گاوان سے اس کے بڑے تعلقات قائم ہوئے۔ گاوان اس کو اپنا فرزند کہتا تھا اور اس کو خوب ترقی دی۔ اس کو بلگام کا گورنر اور سرِ لشکر بنایا۔ گاوان کی شہادت اور محمد شاہ کی وفات کے بعد یہ خود سر ہو گیا۔ عادل شاہی سلطنت میں مہاراشٹر اور کرناٹک کے دونوں علاقے ملتے ہیں۔ یوسف عادل خان اچھا مدبر تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں پرتگالی بھی ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدم جمانے لگے اور گوا پر قبضہ کر لیا۔

یوسف صاحب تدبیر تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے ساتھ نہ صرف خوشگوار تعلقات پیدا کئے بلکہ مرہٹہ خاندان میں شادی کی۔ اسی وجہ سے یوسف اور اس کے جانشین بیجاپور میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ ۱۵۱۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا جانشین اسماعیل بہت چھوٹا تھا اور اس کی وجہ سے سلطنت میں کچھ خلفشار ہوا لیکن اس کی والدہ ماں نے بعض وفادار عمائدین سلطنت کی مدد سے حالات پر قابو پا لیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول جو ۱۵۳۴ء میں اپنے باپ کا جانشین ہوا [illegible] دفاتر جو پٹیل پٹواریوں کے ہاتھ میں تھے مرہٹی زبان میں [illegible] لوگ فارسی سے واقف نہ تھے۔ اس سے مرہٹی زبان کو بہت فروغ ہوا [illegible] بھی مامور ہوئے۔ اسد خان لاری اس عہد کا وزیر باتدبیر ہے جس کی سیاست تاریخ [illegible] ہے۔ اس وزیر کے تدبر سے عادل شاہی سلطنت کو بہت فائدہ پہنچا۔ [illegible] علی عادل شاہ اول تخت نشین ہوا تو اس سلطنت کو اور فروغ ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور دکن کا سورما تھا۔ البتہ یہ زمانہ دکنی سلطنتوں کی رقابت اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت بدنام ہوا۔ احمد نگر کی رقابت میں علی عادل شاہ اول نے بیجانگر کے راجہ رام راج کو اپنی مدد کے لئے دعوت دی اور احمد نگر پر دھاوا بول دیا۔ حسین نظام شاہ والئی احمد نگر نے اس کی روک تھام کی۔ اس نے تمام سلاطینِ دکن میں اتحاد پیدا کیا۔ چونکہ اتحاد شادی بیاہ کے ذریعہ اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے بعض سلاطینِ دکن سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کر دیں۔ ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ برہان عماد الملک کو چھوڑ کر باقی چاروں بادشاہ متحد ہو گئے اور بیجانگر کے خلاف ایک بڑی طاقت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۵۶۵ء میں دکن کی چاروں طاقتیں متحدہ طور پر بیجانگر پر حملہ آور ہوئیں۔

Marfat.com

بیجانگر کو بالآخر شکست ہوئی۔ اس فتح سے دکن کی تاریخ بدل گئی۔ دکنی سلطنتوں کو بہت سا روپیہ اور جواہر ملے اور جنوب میں سلطنتیں وسیع ہوگئیں۔

علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ چونکہ یہ کم سن تھا۔ اس کے سن شعور پہنچنے تک چاند بی بی حکومت کے فرائض انجام دیتی رہی۔ اس طویل عہد میں جو ۱۶۲۶ء میں ختم ہوا۔ بہت سے تمدنی اضافے ہوئے اور فنونِ لطیفہ کو فروغ ہوا۔ مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ڈر کر ابراہیم نے اکبر کو پیش کش دی اور اپنی بیٹی شہزادہ دانیال سے بیاہ دی۔ ابراہیم ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت شاہ جہان ہندوستان کے شہنشاہ تھے۔ ۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا اور اس کے بعد بیجاپور کو شاہجہاں کی سیادت ماننی پڑی۔ دوسری طرف خود دکن میں مرہٹوں کی ایک نئی طاقت پیدا ہوگئی۔ سیواجی نے اسی زمانے میں تاخت و تاراج شروع کی۔ ۱۶۵۷ء میں جب علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو پھر اس سلطنت میں رونق آگئی۔ اس نے ایک طرف سیواجی کو شکستیں دیں تو دوسری طرف مغل حملہ آوروں کو روکا۔ لیکن اس کے انتقال کے بعد جو ۱۶۷۲ء میں ہوا، حالات بدتر ہوگئے کیونکہ اس کا جانشین سکندر عادل شاہ پانچ سال کا بچہ تھا اس کی کمزوری کی وجہ سے ملک کے اندر دھڑا بندی شروع ہوگئی۔ باہر سے مرہٹوں نے حملے شروع کر دیئے اور اس کے علاوہ مغلوں نے علیحدہ لشکر کشی کی۔ بالآخر ۱۶۸۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے اس سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا، جو ترکستان کے ایک قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا۔ اس نے بہمنی دربار میں ملازمت کر لی۔ محمود گاوان کے مرنے کے بعد بیدر آیا تھا اور اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی۔ ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کی وفات کے بعد یہ عملاً خود مختار ہوگیا اور گولکنڈے کو اس نے اپنا مستقر بنایا۔ سلطان قلی کا زمانہ تلنگانہ کے راجاؤں کے ساتھ جنگ و جدل میں صرف ہوا۔ سلطان قلی نے ۹۰ برس کی عمر تک حکومت کی۔ رعایا پرور ہونے کی وجہ سے یہ گولکنڈے میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ ۹۰ برس کی عمر میں (۱۵۴۳ء) اپنے بیٹے جمشید کے ہاتھوں قتل ہوا۔

جمشید کی تخت نشینی کے بعد احمد نگر اور گولکنڈے میں زیادہ خوشگوار تعلقات پیدا ہوئے۔ ۱۵۵۰ء میں اس کا انتقال ہوا اس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سبحان قلی تخت نشین کیا گیا لیکن جمشید کے

Marfat.com

بھائی ابراہیم قطب شاہ نے بہت جلد تخت پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم کے عہد میں سلطنت وسیع اور مستحکم ہوئی، ابراہیم قطب شاہ گولکنڈے کا معمار ہے، جس نے اپنے مدبرانہ نظم ونسق سے سلطنت کو منظم کر دیا۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ اس کا تیسرا بیٹا تخت پر بیٹھا۔ اس کا طویل عہد حکومت ہے۔ جس میں اس سلطنت کو چار چاند لگ گئے۔ شہر حیدرآباد آباد ہوا۔ جس میں تمام عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں جو قطب شاہیوں کی تمدنی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ نے جو ۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اس سلطنت کی بڑی خدمت کی۔ یہ عہد سلطنتِ گولکنڈہ کا معراج تھا۔ لیکن اس کے انتقال کے بعد ۱۶۲۶ء سے سلطنت کو زوال ہونے لگا۔ اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ سلطنت کا اہل نہ تھا۔ اس سے مغلوں نے فائدہ اُٹھایا۔ احمد نگر کے خاتمے کے بعد شاہ جہان نے اس سلطنت کو بھی ۱۶۳۶ء میں اپنے تابع کر لیا۔ عبداللہ کے انتقال کے بعد اس کا داماد ابوالحسن قطب شاہ ۱۶۷۲ء میں تخت نشین ہوا۔ ابوالحسن بڑا بیدار مغز حکمران تھا۔ اس نے گولکنڈے کے ساتھ بیجاپور کو بھی سنبھالنے کی کوشش کی لیکن شہنشاہ اورنگ زیب کے سیلاب کو روکنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ شہنشاہ نے بیجاپور کو فتح کر کے ۱۶۸۶ء میں گولکنڈے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ گولکنڈے کا مدافعتی کرشمہ ہے کہ مغل حملہ آوروں کو آٹھ مہینے محاصرہ کرنا پڑا۔ جب ۱۶۸۷ء میں قلعہ فتح ہو گیا تو ابوالحسن اور اس کے سپہ سالار عبدالرزاق لاری سے خود داری، متانت اور وفاداری کے جو بلند پایہ کردار ظاہر ہوئے اس کی دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مثال ملے گی۔

Marfat.com

بہمنی نظام عدل گستری

سلطنت دہلی کے نظام عدل گستری کے مطالعہ کے بعد وسطی دکن کے نظام عدل گستری کا مطالعہ کسی قدر آسان تو ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وسطی دکن میں نظم و نسق کے جو ادارے قایم ہوئے تھے، ان کی درآمد تمام تر شمال سے ہوئی تھی۔ چنانچہ خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں دکن میں جو ادارے قایم ہوئے، وہ سلطنت دہلی سے متعلق تھے اور دہلی کا نظام عدل گستری ہی دکن میں جاری ہوا۔ لیکن ان اداروں کی تفصیل اور دکن میں ان میں جو نئے خد و خال پیدا ہوئے ان کے بارے میں معلومات نہیں ملتی۔

بہمنی سلاطین اور ادارۂ شاہی

بہمنی سلاطین جو ۱۳۴۷ء سے دکن کی سیاسی کشتی کے ناخدا بنے، وسطی دکن کے بڑے تمدنی معمار ہیں۔ ان سلاطین میں بعض شخصیتیں تو ایسی ہوئیں جو اسلامی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ خود بانی خاندان علاؤالدین حسن کے متعلق علی بن عزیز اللہ لکھتا ہے۔

"آنحضرت اول بادشاہی است کہ در ولایت خلد طراوت دکن صانہا اللہ عن الفتن اسلام برافراختہ شعار ارباب ایمان و عرفان در ان دیار جنت آثار شائع ساختہ و رسوم بدعت نزدم کفر و زندقہ را برانداختہ است" [1]

علاؤالدین حسن ایک بلند خیال اور قابل بادشاہ تھا اور "اس خسرو عالی گہر دادگستر" کو

---

[1] برہان مآثر

علی بن عزیز اللہ نے سکندر ثانی بتایا ہے[1] سلطان قطب الدین کی مسجد میں حسن کو حضرت جنید کا نے تخت نشین کیا تھا[2] اور حسن

بشمشیر فرمان روائی گرفت بداد در رئیس بادشاہی گرفت[3]

محمد شاہ اوّل اور مجاہد شاہ بھی اچھے عالم تھے[4] محمد شاہ دوم کو اس کی رعایاء ارسطو کے نام سے پکارتی تھی۔ اور یہ بڑا عالم اور علم دوست سلطان تھا اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا[5]۔ محمد شاہ کے بعد فیروز شاہ[6] ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل نظر آتا ہے۔ محمد شاہ دوم نے اس کی بڑی اچھی تربیت کی تھی۔ یہ میر فضل اللہ انجو جیسے عالم کا شاگرد تھا[7] اور علم و فضل میں محمد تغلق سے بڑھا تھا[8] یہ مختلف علوم اور السنہ تیز یورپی زبانوں کا بھی ماہر تھا[9]۔ فیروز شاہ ہفتے میں تین دن لوگوں کو درس دیتا تھا[10] بقول فرشتہ "بہ شوکت و عظمت از دیگر شاہان بہمنیہ امتیاز تمام داشت[11]" اور بقول رفیع الدین شیرازی "نظیر نداشت[12]" اور بقول علی بن عزیز اللہ۔

---

[1] برہان ص۵!۔

[2] سید اسد اللہ مختار الاخبار حیدر آباد۔ ۱۲۹۴ھ۔ نیز ملاحظہ ہو۔ انڈین ہسٹری کانگرس (اگست ۱۹۴۳ء) میں شیخ سراج الدین جنیدی پر محبہ صدیقی کا مقالہ روداد کانگرس ص۲۳۸۔

[3] تاریخ مختار الاخبار ص۱۳۔

[4] شیرازی ورق (۸) فرشتہ جلد اول ص۲۸۲، ۲۹۶

[5] شیرازی ورق (۹) فرشتہ نے اس کو محمود شاہ لکھا ہے۔

[6] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ عبد المجید صدیقی۔ فیروز شاہ بہمنی (حیدر آباد اکادیمی ۱۹۴۳ء)۔

[7] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ ا ص۶۲

[8] 〃 〃 ص۷۹

[9] 〃 〃 ص۷۹-۸۰

[10] خافی ص۵۰

[11] فرشتہ ج ا ص۳۰۶-۳۰۷

[12] شیرازی ورق ص۹

Marfat.com

خطبہ تعظیم یافت از نامت | ہم چناں سال مہ معظم باد
از تو آباد ظلم ویران شد | بتو بنیاد عدل محکم باد[١٢]

اور بقول خافی خان "در خاندان بہمنیہ بدان استعداد و کمالات ہیچ سلطان بہ عرصہ وجود نیامدہ بود"[١] فیروز شاہ کا جانشین احمد شاہ ولی بہمنی[٢] بھی ایک غیر معمولی آدمی تھا - یہ بڑا عالم تھا - اور ایک بڑی بصیرت کا سلطان تھا[٣] اس کے دربار میں بڑی بڑی شخصیتیں جمع تھی[٤] اور بقول فرشتہ "قوانین لشکرکشی و آداب فرمان روائی نیکو دانستے"[٥] سلطان علاؤ الدین بھی "زیور حلم و سخا سے آراستہ اور حلیۂ علم و وفا سے پیراستہ" تھا[٦] اور بہمنیوں کے تیرہویں سلطان محمد شاہ لشکری کے متعلق علی بن عزیز اللہ نے لکھا ہے۔

"از سلاطین ہندوستان مثل آن دیگری را دست نداده بود ۔۔۔۔ زاہد شب زنده دار اگر جمال شان در خواب دیدی جیب خرقہ پرہیز چون صبح از مہر شام زلف دلاویز شان بدریدی"[٧]

بہمنی سلاطین علما و مشایخین کی بڑی عزت کرتے تھے - چنانچہ علاؤ الدین حسن حضرت جنیدی کا بہت معتقد تھا[٨] اور احمد شاہ حضرت گیسو دراز کا بہت معتقد تھا[٩] سلاطین علما سے بے تکلفی سے ملتے تھے[١٠] اور ان علما و مشایخین سے بادشاہوں کی دینی اور اخلاقی رہبری ہوتی تھی -

---

١٢ برہان ص١٤١ -
١ خافی ص٥٠ -
٢ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "احمد شاہ ولی بہمنی" مصنفہ محمد ظہیر الدین حیدر آباد ١٩٣٧ء
٣ برہان ص٧٢-٧٣، ١٠ احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص٢٢٢-١٣٢ -
٤ " " محولہ صدر ص٦٥، ١٢٢، ١٢٣ -
٥ فرشتہ ج ١ ص٣١٩
٦ برہان ص٨٧ -
٧ " ص١٠٧
٨ احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص٨-١٠ -
٩ برہان ص٥٤ -
١٠ فیروز شاہ بہمنی مقالہ محولہ صدر ص٥٢ -

Marfat.com

چنانچہ حضرت زین الدینؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کی بیعت نہ کرنے کی وجہ سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا اور شرعی امور میں پابندی شروع کی[1] حضرت شیخ زین الدین محمد شاہ کو پند و نصائح کرتے تھے[2]

بہمنی سلاطین کا تصور عدل اور شرع اسلام :-

دوسری اسلامی مملکتوں کی طرح بہمنی سلطنت میں سلاطین یا تو خود اپنے عدلیہ کے فرائض "سلطان عادل" کی حیثیت سے انجام دیتے تھے یا اس کے لئے اپنا نائب مقرر کرتے تھے۔ نیز عدالتی عہدہ داروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید تھی اور قاضی شرع کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔

بہمنی سلاطین عام طور پر شرع کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہمنیوں کے دور میں دکن کو بڑے صاحب سیرت علما اور صلحا نصیب ہوئے۔ جن کا کافی اخلاقی اثر تھا۔ چنانچہ محمود بہمنی کے اوائل عہد میں دکھنیوں اور آفاقیوں میں جھگڑا ہوا۔ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ علما و صلحا نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی[3]۔ اس طرح جب قاسم برید اور دوسرے ترکوں نے چند دکھنیوں اور ترکوں کو قتل کر دیا تو بادشاہ نے خود بیچ بچاؤ کرایا۔ اور ترکوں کا ایک مہینے تک سلام نہیں لیا۔ شاہ محب اللہ نے محمود شاہ کے پاس آکر سفارش کی تو بادشاہ نے ترکوں کا قصور معاف کر دیا[4] بعض مشہور بزرگ خود بہمنیوں سے پہلے آئے تھے اور بعض بہمنیوں کے زمانے میں آئے۔

ان علما و صلحا سے عوام کے علاوہ خود سلاطین بھی متاثر تھے۔ چنانچہ بانی سلطنت حسن حضرت شیخ سراج جنیدیؒ کا بہت معتقد تھا اور ہر کام ان کے مشورے سے کرتا تھا[5] حسن پہلا بادشاہ ہے، جس نے دکن میں علی الاعلان اسلام و شعائر اسلام کی اشاعت کی[6]۔ یہ شرع کا بہت پابند تھا۔ چنانچہ خود جنگ و جدل میں بھی حسن نے اسلامی اصولوں کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مثال کے طور

---

[1] احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص۱۲ -

[2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۹۴-۲۹۵ -

[3] فرشتہ ا ص ۳۶۴ -

[4] " " ص ۳۶۷ -

[5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ عبدالمجید صدیقی شیخ سراج جنیدی محولہ صدر نیز ملاحظہ ہو (رفیع الدین) فیرازی ۔۔۔

[6] ملکاپوری ص ۲۱۲ -

پر مال غنیمت کو حسن نے فوجوں میں تقسیم کیا[1] محمد شاہ رعایا کی آسائش کو اپنے آرام پر ترجیح دیتا تھا اور ان کے جان و مال کی حفاظت کو فرض سمجھتا تھا۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ اور عمال و حکام بھی بادشاہ کے پیرو تھے[2] محمد شاہ اول کے عہد میں ایک بزرگ حضرت شیخ زین الدین رح تھے۔ ان کی اسلام شعاری کا یہ حال تھا کہ انہوں نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور خود سلطان کے پوچھنے پر اس کی یہ وجہ بتلائی کہ سلطان شرع کا پابند نہیں اور شراب پیتا ہے۔ شیخ کا محمد شاہ پر اتنا اثر ہوا کہ محمد شاہ نے شراب سے توبہ کر لی اور شریعت کی ترویج کی[3] محمد شاہ کو شیخ پند و نصائح بھی کرتے تھے اور اس کا اثر تھا کہ بادشاہ عادل اور شرع کا پابند ہو گیا[4] فیروز شاہ بہمنی پہلا مسلمان بادشاہ ہے، جس نے رائے بیجانگر کی بیٹی سے شادی کی۔ چند کمزوریوں سے قطع نظر، فیروز شاہ شرع کا بہت پابند تھا[5] اور خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا تھا[6] حاجی محمد قندھاری کی روایت کے مطابق تو فیروز شاہ اتنا متشرع تھا کہ ہر روز ربع جزو قرآن لکھ کر اپنی معاش پیدا کرتا تھا[7] اور خدا کی عبادت کے بعد مخلوق کے لئے وقت صرف کرتا تھا۔ احمد شاہ بہمنی بھی پابند صوم و صلوٰۃ تھا[8] اور شرع کی سختی سے پابندی کرتا تھا[9] چنانچہ یہ ولی کے نام سے مشہور ہے۔ احمد شاہ بڑا عالم و فاضل بھی تھا[10] اور اسے "الہام عادل"

---

[1] برہان ص ۲۱، ۲۴۔

[2] ملکاپوری ص ۲۷۔

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۲۹۴ تا ۲۹۵۔ احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص ۱۴-۱۵۔

[4] فرشتہ ص ۲۹۴-۲۹۵۔ احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص ۲۱۔

[5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۳۰۶ تا ۳۰۸۔ شیرازی ورق ۹ احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص ۲۳-۲۶

[6] ملکاپوری ص ۲۱

[7] کریم النفس دیندار بود۔ وجہ معاش خود از کتابت مصحف حاصل می کرد۔ و حرم محترم لباسہا را نقش کردہ می فروخت و معاش خود را ازاں مہیا ساخت۔ شیرازی ورق ۹

[8] احمد شاہ بہمنی محولہ صدر ص ۱۲۳، ۱۲۸

[9] " " " ص ۸۲، ۸۳، ۸۶

[10] " " " ص ۶۳-۶۵

Marfat.com

کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[1] احمد شاہ کے عہد میں لوگ حق شعار اور ایماندار تھے، شرع کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جب نرسنگ رائے کی مدد کے لئے ایخان آیا۔ تو احمد شاہ نے اس سے لڑنے کے لئے علماء سے فتوے حاصل کیا[2] احمد شاہ نے جنگ کے بعد سپاہیوں میں مال غنیمت تقسیم کیا[3] سلطان علاؤ الدین شاہ ثانی جمعہ و عید کے موقع پر ممبر کے نیچے بیٹھ کر وعظ سنتا۔ خلق اللہ کی خونریزی اور ان کو پریشان کرنے سے گریز کرتا تھا[4] کبھی کبھی جمعہ و عیدین میں جامع مسجد میں خطبہ بھی پڑھتا تھا[5]۔

---

[1] احمد شاہ بہمنی خولہ صدر ص ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴)
[2] " " " (۱۲۹)۔ (ملاحظہ ہو ۔۔۔ ۔۔)۔
[3] برہان ص ۶۲-۶۳-)
[4] " " ص ۶۴ -
[5] فرشتہ ۱ ص ۳۳۳)
[6] " " ص ۳۳۸)

محکمۂ عدلیہ

دوسرے اسلامی حکمرانوں کی طرح بہمنی سلاطین بھی دین اسلام کے محافظ رعایا کے باہمی مناقشوں میں "حکم" اور فوجوں کے اعلیٰ ترین افسر سمجھے جاتے تھے۔ پہلی حیثیت میں تو سلطان دیوان قضاء کے توسط سے داد رسی کرتے تھے۔ دوسری حیثیت سے عدالت فوجداری کے ذریعہ اور تیسری حیثیت سے خود سلطان یا اس کے فوجی سپہ سالار یا قاضی عسکر فوجی عدالت کا اجلاس کرتے تھے۔ بہمنیوں کا عدالتی انتظام بالکل شرعی تھا۔ قاضیوں کو عدالت کا کامل اقتدار حاصل تھا۔ عدالتیں شرعی قانون پر عمل کرتی تھیں اور سلطان کے علاوہ صدر، قاضی، مفتی اور محتسب وغیرہ بھی شرعی احکام کے اجرا میں کسی قسم کی تاخیر گوارا نہ کرتے تھے۔ اور فقہی امور کی پابندی کرواتے تھے۔ سلاطین عدالتوں کا معائنہ کرتے تھے۔ مقدمے کے فریقوں کے بیان سنتے اور حاکم کے فیصلے پڑھتے تھے۔ نیز حسب ضرورت قاضیوں کو صحیح انصاف پر پہنچنے کے لئے ان کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔

بانیِ سلطنت علاؤ الدین حسن نے جہاں مملکت کے نظم و نسق میں حکومت کے مختلف شعبے بنائے وہاں محکمۂ قضا پر بھی خاص توجہ کی اور جس طرح دوسرے اسلامی حکمران انصاف رسانی کو اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ اسی طرح حسن نے بھی عدل گستری کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھا اور رعایا کے حقوق کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔[1]

---

[1] :- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۲۸۰-۲۸۱)

Marfat.com

بلکہ سچ پوچھئے تو حسن نے مرض الموت میں بھی اپنے فرایض عدل سے غفلت نہیں کی چنانچہ سخت بیمار ہونے کے باوجود وہ عدالتی کاروبار پر نظر رکھتا تھا اور بقول فرشتہ خود بھی صبح و شام بلکہ علی الدوام" دربار" میں عدالتی اجلاس کرتا اور داد خواہوں کی فریاد سنتا تھا[1] یہی وجہ ہے کہ بقول علی بن عزیز اللہ" در روزگار فرخندہ آثارش دست ظلم ہیچ ظالم حلقۂ تغلب بر در خانہ رعیتی نزد و پائی ہیچ متمم پیشہ ساخت سرای کسی را بپای مناقشت نفرا حمت نسپرد[2]" بانی سلطنت نے عدلیہ کے انتظام کا جو خاکہ مرتب کیا تھا وہ حسن کے جانشینوں کے زمانے میں بھی قایم رہا[3] البتہ فیروز شاہ بہمنی نے ایک اور عدالت" دفتر شاہی" کے نام سے قایم کی ۔ یہ دفتر وکیل مطلق کو سپرد تھا ۔ مملکت کی عدالتوں کے اہم فیصلے دفتر شاہی میں آتے تھے ۔ وکیل مطلق ان کی جانچ پڑتال کر کے بادشاہ کے ملاحظہ میں گذرانتا اور فیصلے صحیح نہ ہوتے، وہ واپس کر دئے جاتے تھے[4]

مرکز کی عدالتیں

بہمنیوں نے مرکز اور صوبوں میں عدل گستری کی جو تنظیم قایم کی تھی، وہ بہت دلچسپ اور جاذب نظر ہے ۔ پہلے تو مرکز میں قاضی القضاۃ اور قاضی مقرر ہوئے اور ان کے تحت عدلیہ کے دیگر عہدہ دار ۔ پھر ہر شہر اور گاؤں میں بھی ایک ایک قاضی کا تقرر ہوا[5] مرکز میں دو قسم کی عدالتیں تھیں ۔ ایک عدالت فوجداری اور دوسرے دیوانی ۔ فوجداری کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ اور ایک حد تک عدالت ابتدائی خود" دربار" تھا، جہاں سلطان داد خواہوں کی داد رسی کرتا تھا ۔ دیوانی و فوجداری مرافعوں کی اعلیٰ عدالت" صدر عدالت" ٹلر کر تھی، جس کا عہدہ دار صدر یا قاضی القضاۃ ہوتا تھا ۔ صدر عدالت کے فیصلوں سے بھی ناراض ہوتی تو خاص اور اہم مقدمات کی صورت میں دفتر شاہی کے توسط سے سلطان تک

---

[1] فرشتہ ص۲۸۰ ۔

[2] برہان ص۱۵ ۔

[3] برہان ص۳۸-۴۱، ۴۷-۷۶) وغیرہ ملکاپوری ص۲۲۳، ۳۰۳، ۳۹۶، ۴۸۰، ۵۲۶) ۔

[4] ملکاپوری ص۲۱۴ ۔

[5] عزیز مرزا سیرۃ المحمود ۔ نظامی پریس بدایوں (۱۹۳۰) ص۳۸ ۔

Marfat.com

رسائی ہوتی تھی۔ صدر جہاں محکمہ امور مذہبی کا سب سے اعلیٰ افسر بھی تھا۔ اور اس لحاظ سے امور مذہبی سے متعلق جملہ جھگڑے اور نزاعات بھی اس کے پاس پیش ہوتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں صدر جہاں عدالت امور مذہبی کا بھی عہدہ دار تھا۔ مرکز میں فوجداری اور دیوانی کی ان اعلیٰ عدالتوں کے علاوہ ایک ماتحت عدالت فوجداری اور ایک ماتحت عدالت دیوانی بھی تھی، جس کا حاکم قاضی گلبرگہ ہوتا تھا۔ نیز ایک محکمہ احتساب تھا۔ جس کا عہدہ دار محتسب تھا۔ اور ایک عدالتِ قاضی عسکر بھی تھی۔ جس کا حاکم قاضی عسکر ہوتا تھا۔ یہ تو مرکزی نظام عدالت کا نقشہ تھا۔ صوبوں اور ضلعوں وغیرہ میں بھی مرکز ہی کی طرز پر فوجداری اور دیوانی عدالتیں تھیں، جو مرکزی عدالتہائے مرافعہ کے ماتحت تھیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "صدر" جو عدلیہ کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا، مرکزی حکومت میں ان آٹھ وزراء میں سے ایک وزیر تھا جن سے بہمنی حکومت کی "کابینہ" مرتب ہوتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ مرکزی نظم و نسق میں عدلیہ کے "صدر" کی بھی آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ قرون وسطیٰ کی بہمنی سلطنت کی منظم حکومت کا عدالتی انتظام تھا۔ اب کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ بہمنیوں کی عدالتیں کس طرح کام کرتی تھیں اور ان کی نوعیت کیا تھی۔

(ا) عدالت سلطانی

بہمنی سلاطین "دربار" یا "بارگاہ کل" میں فصل خصومات کے لئے اجلاس کرتے تھے اور اس لحاظ سے "دربار" کو "عدالت سلطانی" بھی کہا جا سکتا ہے۔[1] دربار علاؤ الدین حسن کے زمانے میں بڑی عظمت و شان کے ساتھ ہفتہ میں ایک روز یعنی چہار شنبہ کو صبح سے دوپہر تک منعقد ہوتا تھا۔ اور محمد شاہ اول کے زمانے سے جمعہ کے سوا ہر روز دربار ہونے لگا[2] اور دربار کی شان و شوکت بھی بہت بڑھا دی گئی[3] دربار میں بیش قیمت ریشمی فرش ہوتا اور زرین قالین بچھائے جاتے۔ دروازے پر سنہری پردے آویزاں ہوتے اور درمیان میں بادشاہ تخت فیروزہ پر بیٹھتا تھا۔[4] خاصہ خیل، اسلحہ دار اور جوان بھی دربار کی زینت اور عظمت دوبالا

---

(۱): سلطنت دہلی میں سلاطین عدالت شاہی میں اجلاس کرتے تھے۔

(۲): فرشتہ ص ۲۸۸-۲۸۹، ملکاپوری ص ۲۲۶-۲۲۷۔

(۳): تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۲۸۸۔

(۴): " " " ص ۲۸۸-۲۸۹ ملکاپوری ص ۸۴-۸۵

کرتے تھے[1] دربار میں داخلہ کے لئے تین دروازے تھے۔ ہر ایک کے درمیان سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔ ہر دروازے پر سپاہی اور نقیب کھڑے رہتے تھے اور جو لوگ اندر جانا چاہتے، دربان اور نقیب ان کے ہتھیار لے لیتے تھے[2] دربار میں امرا اور وزرا اپنی اپنی جگہ ادب سے کھڑے رہتے۔ لوگ اپنی فریاد سناتے اور عرضیاں پیش کرتے۔ بادشاہ ہر ایک کی فریاد سنتا اور انصاف رسی کرتا۔ اکثر کا تصفیہ اسی وقت ہو جاتا اور جو مستغیث باقی رہ جاتے، ان کی عرضیاں رکھ لی جاتیں اور دوسرے یا تیسرے روز ان کا تصفیہ ہو جاتا[3]۔ مظلوم سرخ لباس پہنتے اور جو شخص سرخ لباس میں نظر آتا، سلطان اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتا[4]۔ اگر حکام اور عمال سے ظلم و زیادتی ہوتی تو مظلوم بالمشافہ بادشاہ کے حضور میں عرض کرتا تھا۔ اس پر بادشاہ مقدمہ کی مسل منگوا کر تحقیق کرتا اور اگر حکام کے فیصلہ میں غلطی ہوتی تو اسے رفع کرتا تھا اور حاکموں کو دوبارہ غور و فکر کی تاکید کرتا تھا[5]۔ اس طرح "عدالت سلطانی" میں ابتدائی قسم کے مقدموں کے علاوہ مرافعے بھی آتے تھے۔ نیز نگرانی کے سلسلے میں بھی مقدمے آتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بادشاہ کے ساتھ وکیل مطلق، صدر اور دیگر قاضی و علما بھی ہوتے تھے۔ بادشاہ ان کے سامنے اپنے عدالتی فرائض انجام دیتا تھا اور ان اعلیٰ عہدہ داروں اور علماء امرا سے حسب ضرورت مشورہ بھی کر لیتا تھا[6]۔ دربار کے علاوہ شکار وغیرہ کے موقع پر بھی سلطان مقدموں کی سماعت کرتا تھا[7]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرکزی و مقامی حکومت (ص ۷-۸)

[2] ملکاپوری ص ۸۵۔

[3] " " "

[4] " " " اس زمانے میں چین میں بھی یہی قاعدہ تھا (دیکھئے "خطائی نامہ" مخطوطہ جو سلطان سلیمان و سلطان سلیم کے زمانے کا ہے)۔

[5] احمد شاہ بہمنی ص ۶۱

[6] مرکزی و مقامی حکومت ص ۷-۱۲، ملکاپوری ص ۸۴-۸۷۔ قاضی کی مجلس شوریٰ بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے چلتی ہے۔

[7] ملکاپوری ص (۱۱۸-۱۲۲)۔

Marfat.com

دفترِ شاہی

عدالت سلطانی کے علاوہ فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں ایک نیا محکمہ قایم ہو گیا تھا جو "دفترِ شاہی" کے نام سے موسوم ہے۔ جس طرح موجودہ زمانہ میں جوڈیشل کمیٹی یا سپریم کورٹ آخری سماعت کرتی ہے۔ اسی طرح "دفترِ شاہی" کا عہدہ دار جو وکیل السلطنت تھا، زیرین عدالتوں کے اہم فیصلوں کو اپنی رائے کے ساتھ بادشاہ کے ملاحظہ میں گذرانتا تھا، اور بادشاہ اس پر مناسب حکم دیتا تھا۔ اور اگر مرافعہ میں کوئی جان نہ ہوتی تو دفترِ شاہی سے درخواست واپس کردی جاتی تھی[1] گویا دفترِ شاہی دیوانی اور فوجداری کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ تھی اور عدالت سلطانی کے بعد اسی کا درجہ تھا۔

(۳) صدر عدالت

دارالسلطنت گلبرگہ میں ایک صدر عدالت تھی، جسے موجودہ زمانے کی عدالت عالیہ کہنا چاہیئے[2]۔ صدر عدالت کا عہدہ دار صدر یا صدر جہاں[3] تھا۔ اس کو دیوانی اور فوجداری کی اعلیٰ عدالت مرافعہ کہنا چاہیئے۔ صدر کے تحت قاضی۔ مفتی محتسب فوجدار اور داروغہ بھی ہوتے تھے[4] مرکز کی اس عدالت مرافعہ میں ضلعوں اور صوبوں سے مرافعے آتے تھے۔ نیز نگرانی و استصواب کے لئے بعض مقدمے پیش ہوتے تھے[5] زیرین عدالتوں کے فیصلوں سے ناراضی ہوتی تو مرافعے کے لئے ایک مہینے کی میعاد مقرر تھی[6] جب مرافعہ صدر عدالت میں پیش ہوتا تو مفتی اور فقیہہ پوری کارروائی کا اچھی طرح جائزہ لیتے اور فیصلے کی جانچ کر لیتے تھے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ صدر جہاں کے پاس پیش کیا جاتا تھا۔ اور صدر جہاں فقیہوں اور مفتیوں کے مشورے سے خود تصفیہ کرتا تھا۔ عدالت زیرین کے فیصلوں میں کوئی غلطی ہوتی تو اس کو ظاہر کر کے ملزم کو رہا کر دیتا ورنہ عدالت زیرین کے فیصلے بحال رہتے[7]

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مدکاپوری ص۷۷ الخ)
لہ فرشتہ ص۲۷۷۔
لہ احمد شاہ بہمنی حوالہ صدر ص۱۶
لہ مدکاپوری ص۷۹-۸۰
لہ احمد شاہ بہمنی ص۱۶)
لہ مدکاپوری ص۷۹-۸۰)

Marfat.com

(۴) عدالت قاضی گلبرگہ یا دارالقضاء[1]

متذکرہ صدر عدالت ہائے مرافعہ کے علاوہ مرکز میں ایک عدالت قاضی بھی تھی جس میں ابتدائی نوعیت کے مقدمے آتے تھے اور اس عدالت کا صدر قاضی گلبرگہ تھا۔ دارالسلطنت کی اس عدالت سے متعلق کوئی تفصیلی معلومات تو حاصل نہیں ہوئیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی گلبرگہ کے سامنے دیوانی نوعیت کے مقدموں کے علاوہ فوجداری مقدمے بھی آتے تھے۔ چنانچہ محمد شاہ دوم کے زمانے کا ایک مشہور فوجی مقدمہ ملتا ہے جو دارالقضاء میں پیش ہوا تھا۔

(۵) محکمہ فوجداری

فوجداری مقدموں کی سماعت کے لئے ایک محکمہ قائم تھا جس میں فوجدار طرفین کے گواہوں کا اظہار لیتے اور پھر اپنی رائے کے ساتھ دارالقضاء میں بھیج دیتے اور قاضی اظہارات کی تصدیق کرکے فیصلہ لکھتے تھے۔ صوبوں اور ضلعوں میں بھی فوجدار مقرر ہوتے تھے چنانچہ ملک وجیہ الدین فوجدار دولت آباد مشہور آدمی ہے۔

(۶) محکمہ احتساب

سلطنت دہلی کے دیوان ریاست کی طرح بہمنیوں نے بھی ایک محکمہ احتساب قائم کیا تھا۔ جس کا عہدہ دار محتسب ہوتا تھا۔ گو بہمنی محتسب کے تفصیلی فرائض معلوم نہیں ہوئے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت دہلی کی طرح محکمہ احتساب میں ان بیوپاریوں کو سزا دی جاتی تھی جو ناپ تول میں دھوکہ دیتے یا کھانے پینے کی چیزوں میں غیر ضروری آمیزش کر دیتے تھے۔

(۷) عدالت کوتوال

کوتوال کو جو پولیس کا افسر تھا، معمولی جرائم کی حد تک بیٹھ کر سزا دینے کا اختیار تھا[2] اور اس لحاظ سے عدالت کوتوالی کو ابتدائی عدالت فوجداری کہا جا سکتا ہے۔

(۸) عدالت قاضی عسکر

فوجی رقبہ کے لئے ایک علیٰحدہ قاضی مقرر ہوتا تھا، جو فوجیوں کے مقدمات کی سماعت کرتا[3]

---

[1]:- فرشتہ صفحہ ۳۰۳

[2]:- احمد شاہ بہمنی سنہ ۵۴ - سیرۃ المحمود صفحہ ۴۶ :-

[3]:- فرشتہ صفحہ ۲۰۲ - مآثر کالیور ی صفحہ ۴۴ :-

مرکز کی ان عدالتوں کے تذکرے کے بعد اب ان عدالتوں کے عہدہ داروں کا بیان کیا جاتا ہے۔

مرکز کے عہدہ داران عدلیہ

علاؤالدین حسن نے سیف الدین غوری کے مشورے سے سلطنت کا جو نظم و نسق قایم کیا تھا(۱) اس میں عدلیہ سے متعلق چند عہدہ دار ملتے ہیں۔ صدر، قاضی عسکر، وکیل مطلق یا وزیر۔ نائب وزیر۔ قاضی گلبرگہ، مفتی، محتسب۔ سید الحجاب۔ حاجب خاص۔ حاجب قصبہ و قباد وغیرہ باربک۔ نائب باربک۔ بانی سلطنت نے عدلیہ سے متعلق جو عہدے قایم کئے تھے، وہ سب اس کے بعد تقریباً ہر زمانے میں قایم رہے۔ البتہ عہدہ دار ضرور بدلتے رہے(۲) بعض دفعہ نئے عہدے بھی قایم کئے گئے۔ مثلاً محمد شاہ اول کے زمانے میں ملا محمد بن مولانا عین الدین بیجاپوری مفتی عسکر تھے(۳) اور ملک سیف الدین غوری وکیل مطلق کو ملک نائب کا اعزاز عطا ہوا تھا(۴) اسی طرح مثلاً فیروز شاہ کے زمانے میں جب ایک نیا محکمہ "دفتر شاہی" کے نام سے قایم ہوا۔ تو وکیل مطلق اس محکمہ کا بھی عہدہ دار تھا(۵)

صدر یا صدر جہان

سلطنت دہلی کی طرح بہمنیوں کا یہ عہدہ دار بھی مملکت کی عدلیہ کا سب سے بڑا قاضی تھا۔ اور محکمہ امور مذہبی کا بھی صدر ہوتا تھا۔ یعنی دہلی کے صدر الصدور(۶) اور قاضی القضاۃ(۷) دونوں کے فرایض صدر ہی سے متعلق تھے۔ چنانچہ وہ صدر، عدالت گلبرگہ کا قاضی

---

(۱):۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرکزی اور مقامی حکومت۔ نیز ملاحظہ ہو فرشتہ صـ۲۷۷-۲۷۸ وغیرہ عصامی صـ۵۲۵-۵۲۸۔ برہان صـ۱۵-۱۷) وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو خافی صـ۱۶-۱۷ وغیرہ۔ مدکاپوری صـ۷۴-۷۵

(۲):۔ برہان صـ۳۸، ۴۱، ۴۶، ۷۶ وغیرہ مدکاپوری صـ۳۷، ۳۹۶، ۴۷۸، ۵۲۶ وغیرہ۔

(۳):۔ مدکاپوری صـ۳۲۳ ۔

(۴):۔ فرشتہ صـ۲۸۲) ۔

(۵):۔ مدکاپوری صـ۴۱۷ ۔

(۶):۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی صـ۱۴۹-۱۵۱، ۱۶۶-۱۶۷، ۱۷۹-۱۸۰ ۔

(۷):۔ " " " صـ ۱۰-۴۵-۸۳-۱۴۹ تا ۱۵۴-۱۶۶ ۔

القضاۃ[1] ہونے کے علاوہ بہمنی سلطنت کے تمام مذہبی امور وغیرہ کا بھی ذمہ دار اعلیٰ عہدہ دار تھا[2]۔ صدر کے تحت قاضی، مفتی، محتسب، فوجدار، درداروغہ ہوتے تھے۔ اوران لوگوں کو صدر عدالت کے عملہ میں سے سمجھنا چاہیئے۔ گو صدر عدالت ایک اعلیٰ عدالت مرافعہ تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں خاص صورتوں میں مقدموں کی سماعت کرتا اور ابتدائی مقدموں کا کام بھی انجام دیتا تھا[3]۔ سلطنت دہلی میں تو بعض اوقات صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کے علیحدہ علیحدہ عہدے ہوتے اور ہر عہدہ پر ایک عہدہ دار مامور ہوتا[4] لیکن دکن میں یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص سے متعلق رہے اور صدر مذہبی امور مذہبی و اوقاف کے کام کے علاوہ عدلیہ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ صدر جہاں کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا تھا[5] اور اس اہم خدمت کے لئے غیر معمولی شخصیتوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ صدر جہاں حکومت میں بہت زیادہ اثر رکھتا تھا اور سلطان کے پاس اسے زیادہ رسائی حاصل تھی۔ چنانچہ باہر کے عالم و فاضل اور شاعر وغیرہ جب دکن آتے تھے[6]۔ صدر جہاں ہی کے توسط سے بادشاہ کے پاس رسائی حاصل کرتے تھے[7] اور وکیل مطلق یا ملک نائب کے بعد دکنی مملکت کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ صدر جہاں مملکت کے آٹھ وزراء میں سے ایک وزیر ہوتا تھا[8]۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ قاضی القضاۃ بھی ہوتا تھا۔ صدر جہاں کو مالک کے دنیوی اقتدار کے علاوہ بڑا تقدس بھی حاصل تھا۔ کیونکہ یہ عہدہ بڑی عالم فاضل فقیہ اور مقدس ہستی کا اس عہدہ کے لئے انتخاب ہوتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے مرض الموت میں اپنے گناہوں سے صدر جہاں ہی کے ہاتھ

۱؎: فرشتہ صـ۲۷۷ ۔ ملکاپوری صـ۹۶

۲؎: " " صـ۲۸۰ ۔ ۲۸۴ وغیرہ

۳؎: ملکاپوری صـ۸۱

۴؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ باب ۵ مقالہ ہذا

۵؎ احمد شاہ بہمنی صـ۱۰۶

۶؎ ظہیر الدین احمد۔ حیدر آباد ۱۹۳۷ء

۷؎ فرشتہ صـ۳۰۲

۸؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مرکزی و مقامی حکومت نیز ملاحظہ ہو احمد شاہ بہمنی صـ۱۰۵

Marfat.com

توبہ کی[1]۔ اور محمد شاہ اوّل کی والدہ جب حج کو گئیں۔ تو اس وقت بھی حج میں صدر جہاں ہی نے ان کی رہنمائی کی[2]۔ اور فرائض کے علاوہ اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ بادشاہ کی تخت نشینی یا دربار کے خاص اجلاسوں کے وقت حاضر رہے[3]۔

وکیل مطلق یا ملک نائب | بہمنی سلطنت میں وکیل مطلق کا سب سے اعلیٰ عہدہ تھا۔ وکیل مطلق جسے وزیر اعظم کہنا چاہیئے، بادشاہ کا نائب تھا اور اسی حیثیت سے بادشاہ کی عدم موجودگی میں وہ بادشاہ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ خود بادشاہ کی موجودگی میں ملک نائب کا اس قدر اثر تھا کہ بادشاہ کوئی کام بغیر اس کے مشورہ کے نہیں کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس میں عدالتی کام بھی شامل تھے۔ وزیر کی اس اہم شخصیت سے قطع نظر عدلیہ سے متعلق اس کا براہ راست تعلق اس طرح بھی تھا کہ وہ "دفتر شاہی" کا افسر اعلیٰ تھا۔ انہی وجوہ کی بنا پر وکیل مطلق "عدلیہ" سے بھی تعلق رکھتا تھا اور اس واسطے سے نائب وزیر بھی تھا۔

قاضی | ہر شہر اور ہر قصبہ میں قاضی مقرر تھے۔ صدر جہاں یا قاضی القضاۃ کے بعد مملکت میں قاضی کا ایک اعلیٰ اور امتیازی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ عموماً اس عہدہ پر بلند کردار اور فقہی معلومات کے ماہر مامور ہوتے تھے۔ قاضی کا عہدہ تاحین حیات ہوتا تھا اور تقرر کے بعد قاضی کو جاگیر مشروط خدمت جاگیر مدد معاش وغیرہ دی جاتی تھی۔ بعض وقت قاضی کو امرا کے طبقہ میں بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ قاضی محمد سراج کو ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ بعض قاضیوں کو خطاب بھی دیا جاتا تھا۔ مثلاً قاضی نظام الدین شریفی کو "شرف جہاں" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اور قاضی جلال کو "قدر خانی" خطاب ملا تھا۔

قاضی کے فرائض میں عدلیہ کے کام کے علاوہ یہ چیز بھی داخل تھی کہ بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت موجود رہے اور بیعت کرے۔ ابتدائی زمانہ میں تو قاضی کے فرائض صرف فصل خصومات کی حد تک تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ قاضی سے مختلف کام لئے جانے لگے۔ چنانچہ نابالغوں وغیرہ کی جائداد کی نگرانی، وصایا کا سرانجام اور اوقاف کی نگرانی نیز مذہبی نوعیت کے تمام امور بھی قاضیوں سے متعلق ہو گئے بعض وقت تو قاضیوں سے سیاسی اور سیاست کاری کے کام بھی لئے گئے چنانچہ فیروز شاہ نے قاضی

---

[1] فرشتہ صـ۲۸۰ –

[2] ؍؍ صـ۲۸۳-۲۸۵ –

[3] ؍؍ صـ۲۷۷-۲۷۹ –

محمد سراج کو دیورائے کے پاس بھیس بدل کر بھیجا تھا[1] اسی طرح قاضی بہاؤ الدین کو نرائن کے پاس بطور سفیر کے بھیجا تھا[2]

مفتی | عدلیہ کا ایک اور اہم عہدہ دار مفتی تھا۔ یہ عہدہ فقیہ ہوتا تھا۔ جو قاضی کو قانونی مشورہ دیتا۔ مفتی ہر قاضی کے ساتھ مقرر ہوتے تھے۔ اور قاضیوں کی طرح مفتیوں کو بھی جاگیر بشرط خدمت یا جاگیر مدد معاش دی جاتی تھی۔ لیکن بہمنیوں کے عدالتی انتظام میں اس چیز کا پتہ نہیں چلتا کہ سلطنت دہلی کی طرح بہمنی سلطنت میں بھی ہندوؤں کے دیوانی معاملات میں قاضی کو قانونی مشورہ دینے کے لئے پنڈت مقرر تھے یا نہیں۔

محتسب | صدر عدالت اور ہر قاضی کی عدالت میں مفتی کی طرح محتسب بھی ہوتا تھا جو عام اخلاق کی نگہداشت کرتا اور کمزوروں کو ظالموں کے ظلم سے بچاتا تھا۔ الحسبہ جو بغداد میں قائم تھا اس کا مقصد قانون ملک اور تمام احکام کی پابندی اور نفاذ کروانا تھا۔ بغداد کی پیروی میں سلاطین دہلی نے بھی یہ ادارہ قائم کیا اور بہمنیوں نے بھی دہلی کی طرح دکن میں محکمہ احتساب قائم کیا۔ بقول علی بن عزیز اللہ "محتسبان را امر شدہ بود کہ عوام [illegible] را باز دارند و ادائے [illegible] اسلام [illegible] و حلال و حرام ارشاد نمودہ شرائع دین [illegible] تعلیم نمایند و از معاصی و مناہی توبہ فرمایند"[3] دہلی اور دکن میں فرق صرف اتنا تھا کہ دہلی میں محتسب امیر داد کے ماتحت ہوتا تھا اور دکن میں وہ صدر جہاں اور قاضیوں کے ماتحت۔ محتسب کے فرائض تقریباً وہی معلوم ہوتے ہیں جو دہلی میں متعین تھے۔ بہمنیوں کے یہاں محتسب کی کافی اہمیت تھی اور ہر سلطان اپنی تخت نشینی کے بعد قاضی اور مفتی کے ساتھ محتسب کا بھی تقرر کرتا تھا۔ تقرر کے بعد محتسبوں کو قاضیوں اور مفتیوں کی طرح جاگیر بشرط خدمت اور جاگیر مدد معاش دی جاتی تھی۔ قاضیوں اور مفتیوں کی طرح محتسب بھی مرکز

ا :- تفصیل کے لئے ملاحظہ فرشتہ ص ٢٩٠-٢٩٣، ١٠١٣-نظامی ص ٣٣-٦٠-بخش ص ٩٦-١٠٨، ١٣٤-ادیغیرہ تاریخ سلاطین دکن-١٠١١ھ-مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ص ٢-١٣٠-

٢ :- برہان ص ٣٢-٣٣-طباطبائی ص ١٩٣

٣ :- بشیر احمد ص ١١٥-

٤ :- برہان ص ٨٠-

کے علاوہ صوبوں اور ضلعوں وغیرہ میں بھی مقرر ہوتے تھے۔ بعض محتسبوں سے محکمہ احتساب کے فرائض کے علاوہ دوسرے کام بھی لئے گئے مثلاً شیخ ملک محتسب کو حاجب مالوہ بنایا گیا تھا۔

حاجب اور باربک وغیرہ حاجب اور باربک کا عدلیہ سے تھوڑا بہت تعلق تھا۔ سلاطین دہلی کے عہد میں تو ایک ہی شخص کا نام "امیر حاجب" اور باربک دونوں عہدوں پر مشتمل ملتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر حاجب اور باربک ایک ہی عہدے تھے۔ بعض یورپی مصنفین اس عہدہ دار کو "لارڈ چیمبرلین" سے زیادہ نہیں سمجھتے[1] لیکن یہ بات حقیقت سے بہت دور جا پڑتی ہے۔ دراصل باربک دربار کے رسوم اور آداب کا عہدہ دار تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ دربار میں امراء و عہدہ داروں کی نشست کا حسب مراتب انتظام کرے۔ نیز وہ دربار کے موقع پر شاہی آداب کی پابندی کرواتا تھا۔ باربک کے مددگار حاجب تھے جو بادشاہ اور رعایا کے درمیان کھڑے ہوتے اور بادشاہ سے آنے والوں کا تعارف کراتے تھے۔ سلطان کے حضور میں جو درخواستیں پیش ہوتیں وہ امیر حاجب یا اس کے مددگاروں کے توسط سے جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے اس عہدے کا بڑا وقار تھا اور سلطنت دہلی میں شاہی خاندان کے افراد یا بادشاہ کے خاص مصاحب ہی اس فرض کو انجام دیتے تھے۔ تیمور کے بعد امیر حاجب کی اصطلاح تو نہیں ملتی البتہ باربک اور نائب باربک ضرور مقرر ہوتے تھے۔ چنانچہ سکندر خاں باربک اور ملک شادی نائب باربک کا تقرر خود بانی سلطنت نے کیا تھا۔ سلطان کے ساتھ چند حاجب ضرور موجود ہوتے تھے۔ اور بعض قابل بھروسہ حاجبوں کو سلطان ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور شاید اسی وجہ سے یہ حاجب خاص کہلاتے تھے۔

حاجب اور باربک کے علاوہ فوجدار اور داروغہ بھی محکمہ عدلیہ کے اہم عہدہ دار تھے۔ فوجدار تو فوجداری مقدموں میں فریقین کے بیانات قلمبند کرکے اپنی رائے کے ساتھ مثل کو قاضی کے پاس بھیجتے تھے۔ جس پر قاضی فیصلہ لکھتا تھا[2] داروغہ عدالتوں کا تعمیلی عہدہ دار تھا۔ نیز کاتب منشی خزانہ دار اور چپراسیوں وغیرہ کا بھی ہر عدالت

---

[1]:- ملاحظہ ہو RAVERTY کا ترجمہ "طبقات ناصری" ص ۸۲۱ ۔

[2]:- ملکاپوری ص ۸۷-۸۸ ۔

میں ایک عملہ ہوتا تھا۔ حاجب عرضی کا بھی ایک عہدہ ملتا ہے[۱]

بہرحال یہ مرکز کی عدالتوں اور عہدہ داروں کا مختصر سا حال تھا۔ مرکز کے اس نظام عدلیہ کے بہ یک نظر مطالعہ میں ذیل کے جدول سے سہولت ہوگی۔

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
۱۔ عدالت سلطانی یا دربار	ابتدائی مرافعہ	سلطان
۲۔ دفتر شاہی	اعلیٰ عدالت مرافعہ	
	دیوانی و فوجداری	وکیل مطلق یا نائب وزیر
۳۔ صدر عدالت	مرافعہ دیوانی و فوجداری	صدر جہان
۴۔ عدالت قاضی کلبرگہ یا دارالقضاء	ابتدائی دیوانی و فوجداری	قاضی کلبرگہ
۵۔ محکمہ فوجداری	ابتدائی فوجداری	فوجدار
۶۔ عدالت کوتوال	معمولی قسم کے جرائم	کوتوال
۷۔ محکمہ احتساب	امور متعلق احتساب	محتسب
۸۔ عدالت قاضی عسکر	فوجی چھاؤنی کی عدالت	قاضی عسکر

اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بہمنی سلاطین نے عدلیہ کے انتظامات کو زیادہ موثر بنانے کے لئے خبر رسانی کا بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ [illegible] کی طرح پوسٹ یا پرچہ کا کافی اچھا انتظام تھا۔ بادشاہ کو معاملات سے باخبر رکھنے کے لئے [illegible] موجود تھے۔ اور وقائع نگار (کا نیز) ایک خاص عہدہ تھا جس کے ذریعہ بادشاہ کو مختلف امور مملکت سے متعلق معلومات فراہم ہوتی تھیں۔

نظائر اور سزائیں۔ بہمنی سلاطین عام طور پر بہت رحم دل تھے۔ اور [illegible] سے کام لیتے تھے۔ بہمنیوں کی پوری تاریخ میں صرف ہمایوں کا نام ایسا ملتا ہے جو بہت سخت گیر تھا۔ یہ طرح طرح کی سزائیں دیتا تھا اور سزاؤں کے نفاذ میں بڑی بے رحمی سے کام لیتا تھا۔[۱] ایک آدھ مثال کو چھوڑ کر بہمنیوں میں کم و بیش تمام سلاطین رحم دل نظر آتے ہیں۔ خود بانی سلطنت کی رحم دلی کا ثبوت اس وقت ملتا ہے جب مملکت کے [illegible] قیدیوں کو اس نے مرض الموت کے زمانہ میں رہا کر دیا۔ اور ان [illegible] کو جو [illegible] یا داشت میں قید

۱۔ برہان ۔ ۱۴

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو [illegible]

تھے اور جو قابل قتل تھے ان کو بیٹے کے سپرد کر دیا کہ کم از کم اپنی زندگی میں ان کا قتل نہ ہوئے[1] اس طرح علاؤ الدین ثانی کی رحم دلی کا یہ حال تھا کہ اس نے سخت سے سخت سزا صرف حبس دوام کی دی اور قتل کو پسند نہیں کیا[2] لیکن اس رحم دلی کے باوجود بہمنی سلاطین قاضیوں کے حکم سے قتل یا قصاص میں مداخلت نہیں کرتے تھے[3] اور اس وقت سے جب کہ شیخ زین الدین نے محمد شاہ اول پر نکتہ چینی کی تھی اور اسے شعار اسلام کی پابندی کا سبق دیا تھا[4] بہمنی سلاطین نے اوامر و مناہی کی پابندی کرانے میں پوری کوشش کی اور تعزیری سزائیں برابر نافذ کیں۔ گو اسلامی تعزیرات کی پوری طرح پابندی نہ ہو سکی۔

بہمنی سلطنت کے زمانہ میں سب سے زیادہ سزائیں صرف باغیوں کو دی گئیں۔ اور بغاوت کو بہت سنگین جرم سمجھا جاتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ بغاوت کے الزام میں عدالتوں کے فیصلے پر انحصار ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور سلطان خود سزا دیتا تھا۔ لیکن باغی کو سزا دینے سے پہلے مفتیوں اور فقیہوں کا فتویٰ ضرور حاصل کر لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اسماعیل مخ کے قتل سے پہلے علاؤ الدین حسن نے فتویٰ حاصل کیا[5]

بغاوت کے بعد دوسری بڑی سزائیں چوروں اور ڈاکوؤں کو دی گئیں۔ مثال کے طور پر محمد شاہ اول نے چھ سات ماہ میں ۲۰ ہزار رہزنوں کو قتل کیا[6] خلف حسن کو تسخیر سنگیر کے لئے روانہ کیا گیا تاکہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کا استیصال ہو جائے۔ ظالموں کو جو رعایا پر ظلم کرتے تھے سخت سزا دی جاتی تھی اور قمار بازوں اور بدمعاشوں کو بھی بہت سزائیں دی جاتی تھیں سکہ گلا دینا بھی بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب دکن کے صرافوں نے بہمنیوں کے سکے مسلسل گلانے شروع کئے اور وہ اپنے اس جرم سے باز نہ آئے تو تمام صرافوں

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ ص ۲۸۰-۲۸۱ ۔

[2] ۔ ملکاپوری ص ۵۵۳ ۔

[3] ۔ " " " ۔

[4] ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے خافی ص ۳۵ ۔

[5] ۔ " " " برہان ص ۱۸-۱۹ خافی ص ۱۹ ۔

[6] خافی ص ۳۵ غلام صمدانی خان گوہر ص ۲۷-۲۸ ۔

Marfat.com

کو قتل کیا گیا[1] قتل کے بدلے قتل کی سزا دی جاتی تھی ۔ اور شریک جرم کو بھی قتل کی سزا دی تھی ۔ ایک دفعہ سلطان علاؤ الدین ثانی جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے اور اس خطبہ میں اپنے متعلق یہ الفاظ کہے ۔" السلطان العادل الکریم الحلیم الرؤف علی عبادالله الغنی علاؤ الدنیا والدین علاؤ الدین "۔ اس پر ایک عرب تاجر اٹھ کھڑا ہوا اور جس طرح خلفاء راشدین کے عہد میں خلیفہ پر کھلی نکتہ چینی ہوتی تھی ۔ اور لوگ اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے تھے ۔ اسی طرح تاجر نے ممبر کے قریب آکر کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو عادل ہے نہ کریم ۔ رحیم ہے نہ رؤف ۔ تو ظالم ہے ۔ جھوٹا ہے ۔ مسلمانوں کے منبر پر کھڑے ہو کر تو جھوٹ بولتا ہے ... وغیرہ" تاجر کو دراصل شکایت یہ تھی کہ جو گھوڑے بادشاہ نے خریدے تھے ، ان کی قیمت کارکنوں نے ادا نہیں کی تھی ۔ سلطان عرب کے الزام سے بہت متاثر ہوا ۔ فوراً گھوڑوں کی قیمت دلوا دی اور کارکنوں کے فعل سے اتنا رنجیدہ ہوا کہ زار زار رونے لگا ۔ اس کے بعد وہ محل میں گیا اور پھر مرتے تک باہر نہ آیا[2]

ایک سید سیاح کی توہین کے الزام میں سلطان نے شیر ملک کو جو ایک با عزت اور نامی امیر تھا ، موت کی سزا دی ۔ اور اسے قصاب نامی ہاتھی کے پیروں تلے پامال کر دیا تھا ۔[3] خاص شہزادے بھی سزا سے نہیں بچے ۔ مجاہد شاہ نے بچپن میں شاہی خزانہ میں داخل ہو کر سونے چاندی کے سکے اٹھا لئے اور اپنے ساتھی بچوں میں تقسیم کر دیئے ۔ خزانہ دار نے محمد شاہ سے عرض کیا ۔ مبارک تنبول دار کے ذریعہ مجاہد شاہ کو بلوایا گیا اور اسے اس چوری کی سزا میں چند کوڑے مارے گئے[4] بزرگ زادوں کو بھی برابر سزا دی گئی ۔ علاؤ الدین ثانی نے شراب خواری اور عیاشی کی علت میں حضرت بندہ نواز کے پوتے کو شاہراہ پر کوڑے لگوائے اور قحبہ کو شہر بدر کر دیا[5]

ایک اور دلچسپ مقدمہ زنا سے متعلق ملتا ہے جس میں ایسی عورت پر چار مردوں سے

---

[1] ملکاپوری صہ ۲۲۸

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو برہان صہ ۸۰

[3] " " " صہ ۳۳ ، ۳۴ ، فرشتہ صہ ۲۸۳

[4] " " " صہ ۲۵۶

[5] فرشتہ صہ ۳۴۳ ۔

Marfat.com

زنا کا الزام تھا۔ قاضی نے عورت سے سوال کیا تو زانیہ نے کہا کہ چوں کہ مرد کے لئے چار عورتیں جائز ہیں۔ اس لئے اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ عورت کے لئے بھی چار مرد جائز ہوں گے۔ اور اس غلط فہمی اور شبہ میں میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ اور کہا کہ اب میں گناہ سے آگاہ ہوئی ہوں۔ آیندہ ایسا نہیں کروں گی۔ قاضی صاحب عورت کے جواب سے متفکر تھے کہ کیا فیصلہ کرے۔ اس وقت سلطان محمد شاہ دوم نے جو دارالقضاء میں معائنہ کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب سے کہا کہ شرع میں شبہ سے حدود ساقط ہو جاتے ہیں، اس عورت کو چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ عورت شبہ کی بناء پر حد شرعی سے نجات پاگئی [1]

---

[1]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو برہان صفحہ ۳۰۴ -

Marfat.com

نظام شاہی نظام عدل گستری

بہمنی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اس کے کھنڈروں پر دکن کی جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں برار اور بیدر کی تو بہت چھوٹی سلطنتیں تھیں اور ان کی زیادہ تاریخ بھی نہیں ملتی۔ برار اور بیدر کے نظم و نسق اور عدالتی نظام سے متعلق بھی کوئی مواد نہیں ملتا۔ اس لئے ہم کو یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ بہمنی نظام عدل ہی ان کی کسی نہ کسی شکل میں عماد شاہیوں اور برید شاہیوں کے نظم و نسق کی اساس رہا ہوگا۔ اس کے برخلاف احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی بڑی تاریخ ہے۔ یہ سلطنتیں کم و بیش دو سو سال قائم رہیں اور انہوں نے اپنی تاریخ و تمدن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ اگرچہ یہ بھی بہمنی نظم و نسق کی پیرو تھیں لیکن ان کے اپنے اضافے بھی ہیں۔ اس لئے ان تین بڑی سلطنتوں کے نظام عدل گستری کا مطالعہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے شمال کی سلطنت احمد نگر قابل مطالعہ ہے۔

محکمہ عدلیہ

بہمنیوں کی طرح نظام شاہیوں نے بھی عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا۔ چنانچہ ہر شہر میں جو عدالتی حاکم ہوتے تھے، ان کا تعلق انتظامیہ سے بالکل نہ تھا۔[1] احمد نگر کے عدالتی نظم و نسق سے متعلق کوئی تفصیلی معلومات تو حاصل نہیں ہوتیں لیکن بعض باتیں اس سلسلہ میں ضرور قابل ذکر ہیں۔

---

[1] شیخ چاند ملک عنبر ص ۱۶۱ ۔

Marfat.com

بانی سلطنت کے انتظام مملکت کے سلسلہ میں علی بن عزیز اللہ نے لکھا ہے کہ "نظر التفات و عنایت بہر حال کافہ سپاہ و رعیت انداختہ سایہ مرحمت بر ضبط امور مملکت و نسق اسباب جمعیت و رفاہیت رعیت افگندہ مرسوم بدعت لزوم جور و اعتساف را مرتفع ساختہ ابواب عدالت و انصاف داد گستر پرداخت"[1] ایک اور جگہ لکھا ہے کہ احمد نے مسند عدالت پر بیٹھ کر دلبت رائے اور مسند عالی کے قبضہ کی کیفیت دونوں سے سنی اور تصفیہ کر دیا۔ احمد کے سامنے بکیک کے سلسلہ میں ایک مرافعہ بھی آیا تھا۔ احمد کے عہد میں ایک قاضی خواند محبس کا بھی ذکر ملتا ہے۔

بعد کے زمانہ میں عدالتی عہدوں پر قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا۔ جو فیصلے کرتے تھے۔ قاضی کے عہدے پر بہت لائق اور ذی علم اشخاص کا تقرر ہوتا۔ چنانچہ علی بن عزیز اللہ نے قاضی حسن کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور ملک عنبر کے زمانہ میں حضرت نظام الدین قاضی عنبر ایک بڑے بزرگ اور بلند پایہ عالم تھے۔ سب سے بڑے قاضی یعنی صدر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مصنف برہان نے قاضی حسن کا تذکرہ کیا ہے۔ قاضیوں کے ذمے عدالتی اور انفصالی کام کے علاوہ غالباً محکمہ احتساب کے فرائض بھی تھے۔ چنانچہ ناپ تول کے پیمانہ کی دیکھ بھال قبالوں کی تصدیق وغیرہ قاضی ہی کرتے تھے۔ نظام شاہی سلطنت میں قاضیوں کا وقار بھی بہت تھا۔ علماء و فضلاء کے ساتھ سلطان کے ہاں انہی کی رسائی ہوتی تھی۔ چنانچہ خاص موقعوں پر قاضی اور علماء و فضلاء ہی بادشاہ کا استقبال کرتے تھے۔ نیز دشمن سے صلح کی گفتگو کے لئے بھی قاضی روانہ کیے جاتے تھے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں جس نے زنجیر عدل لگوائی تھی، ایک دیوان مظالم کے قیام کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جرائم میں سب سے بڑا جرم بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی سزا قتل تھی۔ محکمہ عدلیہ کے سلسلہ میں حاجیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حاجب جنگ میں بھی حصہ لیتے تھے چنانچہ چاند بی بی کے وقت فصیل کے شگاف کو درست کرتے اور جم کر مقابلہ کرنے کے لئے حجاب بھی دوڑتے آئے۔ احمد نگر میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے حاجب بھی بلوائے گئے تھے۔ جس کا مقصد آپس کی دوستی اور مصالحت تھا۔[2]

۱؎ برہان ص ۲۰۵ ۔

۲؎: برہان ص ۶۰۲ ۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قیام امن و امان اور عدلیہ کے احکام کے نفاذ کے لئے کوتوال بھی مقرر ہوتے تھے۔ سلطنت دہلی یا بہمنیوں کی طرح محتسب مقرر نہ تھے بلکہ قاضی ہی محتسب کے فرائض انجام دیتا تھا۔ دیوان مظالم قایم تھا۔ بہمنیوں نے مظالم کی اصطلاح قائم نہیں کی، لیکن نظام شاہیوں نے سلطنت دہلی کی طرح دیوانِ مظالم قایم رکھا۔ بہمنیوں کے وکیل مطلق کا مددگار پیشوا ہوتا تھا۔ احمدنگر میں وکیل اور پیشوا کا ایک ہی عہدہ ہو گیا۔ صوبہ جاتی حکومتوں میں قاضی کوتوال اور حاجب تو ملتے ہیں۔ لیکن ان کے اختیارات اور فرائض سے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔ نیز یہ بات بھی نہیں معلوم ہوتی کہ مثلاً ضلع یا پرگنے کے قاضی اور کوتوال براہ راست کس کے ماتحت تھے۔ اس لئے بہمنیوں کے صوبجاتی انتظام کو پیش نظر رکھ کر یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ نظام شاہیوں نے بھی بہمنی انتظام کی پیروی کی ہو گی۔ بہمنیوں کی طرح نظام شاہیوں نے بھی عدلیہ کو عاملہ سے الگ رکھا۔

Marfat.com

عادل شاہی نظام عدل گستری

بیجاپور کی سلطنت کا دکن کے تمدن میں بہت بڑا حصہ ہے۔ دکن کی پانچوں سلطنتوں میں جو سلطنت بہمنی کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھیں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے اور تمدن کے تمام شعبوں میں اس کا نمایاں حصہ ہے۔

محکمہ عدلیہ

عادل شاہیوں کے محکمہ عدلیہ کے مطالعہ میں بہمنی نظم و نسق کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ بیجاپور کا نظم و نسق بہمنیوں ہی کا نقش ثانی ہے۔ عادل شاہی انتظام عدالت بالکل شرعی تھا۔ اور سلاطین اپنے عدلیہ کے عہدہ داروں کو شرع کے مطابق فیصلہ کرنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔

مرکز کی عدالتیں

بادشاہ سب سے اعلیٰ حاکم عدالت تھا اور اس کو مرافعوں کی سماعت کا آخری اختیار حاصل تھا۔ سلاطین روزانہ صبح دربار میں آکر بیٹھتے اور رعایا کی عرضداشت سنتے اور مناسب حکم صادر کرتے تھے۔ شاہی محلات میں عدالت محل کے نام سے ایک بلند محل تھا[1] ایک عدالت اندرون قلعہ ارک بھی تھی۔ لیکن بعد کو سلطان محمد نے قلعہ کے باہر ایک داد

---

[1] زبیری ص ۳۴۱

محل بنا دیا اور عدالت گاہ مقرر کر دی۔ اس کے لئے ایک عالیشان عمارت بنائی گئی تھی اور اسی محل میں آثار نبوی اور تبرکات کے لئے ایک حصہ مختص تھا جس کی زیارت کے لئے لوگ آتے تھے[1] لیکن قلعہ سے باہر اس نئی عمارت کی جو تعمیر ہوئی تو مغل شہنشاہیت نے اعتراض کیا اور اسے اپنی "شان خلافت" کے خلاف سمجھا[2] اس آخری دور میں سلاطین اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ مجبوراً پھر اندرون قلعہ عدالت قایم ہو گئی۔ سلطان کو عہدہ دار مملکت کے پورے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ اور سلطان سزا و جزا کا تصفیہ کرتا تھا۔ نیز جاسوس بھی سلطان کو مملکت کی دیگر شہروں کے علاوہ عدلیہ کے کاموں سے بھی باخبر رکھتے تھے۔ سلاطین عدالتی فرائض کی انجام دہی کے وقت مملکت کے بڑے عالموں اور فاضلوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی عہد میں شاہ فتح اللہ شیرازی جو بہت بڑے پایہ کے عالم تھے اور ابو القاسم انجو اور مرتضٰی خان انجو وغیرہ ہمیشہ سلطان کے جلیس رہا کرتے اور اپنی معلومات سے سلطان کو مدد دیتے تھے۔

مرکز کے عہدہ داران عدلیہ میں صدر، قاضی القضاۃ، قاضی، مفتی، محتسب، حاجب وغیرہ ملتے ہیں۔ چونکہ بیجاپور کا محکمہ عدلیہ بہمنی سلطنت کے عدلیہ کا چربہ سمجھا جا سکتا ہے، اس لئے مرکزی عدالتوں کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مرکز میں ایک کوتوال بھی ہوتا تھا جو رات دن شہر کی حفاظت کرتا اور قیام امن کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ چوروں اور اوباشوں اور ڈاکوؤں پر اس کی نگر رہتی تھی۔ جہاں کہیں چوری ہوتی کوتوال اس کا سراغ لگا کر چور کو حسب احکام شریعت سزا دلواتا۔ کوتوال کے تحت خانہ دار ہوتے تھے۔ ملزموں کے لئے قید خانے بھی تھے اور قیدیوں کو سرکار سے خوراک ملتی تھی۔ خاص صورتوں میں دوسرا انتظام بھی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر جب اسد خان لاری نے قاسم برید کو سلطان کے سامنے پیش کیا تو اسماعیل عادل شاہ نے قاسم برید کو دوسرے روز دربار عام تک لاری کے پاس رہنے دیا[3]

۱:- زبیری ص ۲۴

۲:- واقعات ص ۲۶۷

۳:- فرشتہ ۲ ص ۳۳

اگل بی نے لکھا ہے کہ مرکز میں کوتوال دیوانی مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ اور فوجداری مقدموں کی سلطان سماعت کرتا تھا۔ لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ صدر جہاں، قاضی، مفتی اور محتسب وغیرہ کی موجودگی میں کوتوال کا دیوانی مقدموں کی سماعت کرنا قرین قیاس نہیں ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے۔ بہمنیوں کی طرح عادل شاہیوں نے بھی معمولی جرائم میں کوتوال کو بطور مجسٹریٹ کے اختیارات دے دیئے ہوں۔

صوبجاتی انتظام

صوبوں سرکار پرگنوں وغیرہ میں سلطان کی طرف سے قاضی مقرر ہوتے تھے۔ نیز جاگیروں میں بھی سلطان ہی قاضی کا تقرر کرتا تھا اور بعض اوقات خود جاگیردار کو عدالتی فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔[1] صوبجاتی قاضیوں کو عدلیہ کے کام کے علاوہ اوقاف اور امور مذہبی کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ ہر سرکار کا سب سے بڑا عہدہ دار عامل تھا۔ اور یہ اپنے عاملانہ فرائض کے علاوہ "سرکار" کے قیام امن کا بھی ذمہ دار تھا۔ نیز دیوانی مقدموں کی سماعت بھی کرتا تھا۔ اور ہر سرکار اور پرگنے میں کوتوال بھی مقرر تھے۔

پرگنوں میں بھی مشہور قاضی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی عبدالنبی بن شیخ مخدوم پرگنہ دیورکنڈہ کے قاضی اور خطیب تھے۔ اور یہ اپنی آبائی خدمت پر فایز تھے۔ قاضی عبدالنبی نے درخواست کی تھی کہ ان کے بیٹے غلام حسین کو اس پرگنے کی قضاعت اور خطابت پر مامور کردیا جائے چنانچہ قاضی غلام حسین کا اس پر تقرر ہوگیا تھا۔

عادل شاہیوں نے صوبجاتی نظم و نسق پر خاص توجہ کی تھی اور مملکت کے گوشہ گوشہ میں قیام امن اور اسلامی احکام کے نفاذ کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ علی عادل شاہ ثانی اپنے ایک فرمان میں جو افضل خان سرحوالدار اور سید داؤد حوالدار مدگل کے نام جاری ہوا تھا۔ یہ تاکید کی ہے کہ مدگل میں "ہر کہ از امر شرع محمدی تجاوز در اہمال نماید او را تنبیہ بواجبی سازند در امور شرع محمدی مطیع و منقاد باشند و مسلمانان متوطنان قصبہ و مضافات را تاکید کنند کہ بہ خمس اوقات برائے نماز در مساجد حاضر شدہ ..."[2] نیز اسی فرمان میں یہ حکم بھی تھا کہ کماندار تھانہ کو چاہیئے کہ مالی اور دیوانی اور دیگر تمام امور کے جھگڑے محکمہ شرع

---

[1] جوشی ص ۲۴۴۔ [2] واقعات ص ۳۹۷۔

شریف کے حوالے کرے[1] نیز مقامی عہدہ داروں کو بھی یہ تاکید کی جاتی تھی کہ قاضی کے ساتھ اشتراک عمل کریں ۔ ایک اور فرمان میں یہ حکم ملتا ہے کہ "پہادر پیادہ تھانہ حوالہ محکمہ شرع شریف نمایند"[2]

عادل شاہیوں نے سب سے زیادہ دیہات اور موضعوں کے انتظام پر توجہ کی تھی۔ دیہات میں پنچایتیں ہی عدالتی فرائض انجام دیتی تھیں۔ پہلے جھگڑے کا تصفیہ پٹیل کرتا تھا اور اگر اس سے یہ گتھی نہ سلجھ سکتی تو معاملہ پنچایت کے روبرو پیش ہوتا ۔ پنچایت کے سامنے زبانی یا دستاویزی شہادت پیش ہوتی تھی اور اکثر حلف پر بھی معاملے طے پا جاتے ۔ پنچایت کے فیصلوں کے خلاف مقامی عہدہ دار کے پاس مرافعہ ہو سکتا یا پھر آخری مرافعہ سلطان کے پاس جاتا تھا ۔

عادل شاہیوں کا دستور حکومت

اس موقع پر اس دستور العمل اور ان قواعد و ضوابط کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے ، جو عادل شاہیوں نے اپنے دور حکومت میں روا رکھے ۔ عادل شاہی حکومت کے اس دستور کا ایک مختصر مگر دلچسپ خاکہ ابراہیم زبیری نے دیا ہے ۔ جس کے بعض اقتباسات اس وقت بے محل نہ ہوں گے ۔

محض سنی سنائی باتوں پر بلا ثبوت مواخذہ نہ ہونا چاہیئے ۔ ثبوت ملے تو ضرور سزا دینی چاہیئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو ۔ فریقین مقدمہ کی پوری تحقیقات ضروری ہے اور جو اس میں جھوٹا ہو اسے کافی سخت سزا دینی چاہیئے تاکہ جھوٹے مقدموں کا سد باب ہو جائے ۔ جس قلعہ کے تحت بڑا ملک ہو ۔ وہاں ایک نائب غیبت مقرر کریں ۔ قاضی ۔ خطیب اور دیگر حاکموں کو ہدایت کرنی چاہیئے کہ انصاف پروری اور مظلوموں کی داد رسی کریں اور رعایا سے بہترین سلوک رکھیں ۔ نیز احکام شرعیہ کے مطابق عمل کرنے کی سخت تاکید ہونا چاہیئے ۔ رشوت ستانی کی تا بامکان روک تھام کی جائے ۔ دیانتداروں کی قدر کی جائے ۔ تمام ملک میں یکساں اوزان ہوں ۔ ضرر رسی کم نہ ۔ تی زیادہ نماز جمعہ اور خطبہ کا معقول انتظام ہونا چاہیئے اور اہل ملک کو ہدایت کر دی جائے کہ جامع مسجد میں آکر نماز پڑھیں اور دوسرے مذہب کے تہوار مثلاً ہولی

---

[1] واقعات ۳ ص ۔ ۳۹۷ ۔

[2] واقعات ۳ ص ۴۰۷ ۔

Marfat.com

دیوانی وغیرہ میں معترض نہ ہوں - مال غنیمت اور زکواۃ اور خمس وغیرہ سب جامع مسجد اور آثار محل میں جمع رہیں اور حسب احکام شرع ان کا مصرف ہو - ان مصارف کے لئے ایک کمیٹی مقرر رہنی چاہیئے جس کے ارکان میں دو قاضی دو مفتی دو مشائخ دو صدر الصدور اور ایک خطیب مسجد جامع اور خطیب عیدگاہ اور ایک امین اور کوتوال شریک ہوں - شہر کے دروازوں پر واقعہ نویس اور اخبار گو معتبر اور چند سوار رہا کریں - جن کی نشست باری باری سے مقرر رہے - کوئی اجنبی بلا اجازت الوآب شہر کے اندر آسکے نہ شہر سے باہر جاسکے - دار الضرب میں جو طلائی اور نقرئی سکے بنتے ہیں، ان میں کھوٹ ملانے کو بڑا جرم سمجھا جائے - قاضی - مفتی شیخ المشائخ - سلطان اور دیگر حکام عوام کو منہیات اور منکرات سے باز رکھتے اور سنت رسول کی اطاعت کرنے کی تلقین کرتے رہیں - چوری کی سزا حسب شرع شریف دی جائے - ایک فرد مملکت کو دوسرے پر ظلم نہ کرنے دیا جائے [1]

نظائر اور سزائیں

ہر متمدن مملکت کی طرح سلطنت بیجاپور میں بھی بغاوت کو سب سے زیادہ سنگین جرم سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا بھی کافی سخت دی جاتی تھی - چنانچہ جو امراء و عہدہ دار بغاوت کرتے، ان کو منصب سے معزول کر کے قید کر دیا جاتا تھا [2] بعض دفعہ پوری باغی جماعت کو بھی سزا دی گئی - چنانچہ نائکاں کی بغاوت پر ان کی سرکوبی کی گئی [3] چوری - حرام خواری یا خصلت شنیعہ پر شرع کے موافق سزا دی جاتی تھی [4]

اس موقع پر سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس سے افراد مملکت کی انفرادی آزادی اور خصوصاً افراد کی عزت کا پاس و لحاظ ظاہر ہوتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ایک مہاجن چند بقالوں اور دیگر اشخاص کے ساتھ دروازہ اللہ پور سے شہر کے باہر گیا - دروازہ کے باہر مہتر نائکاں بیٹھا ہوا تھا - مہاجن نے اسے سلام کیا

---

[1] :- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زبیری صـ ۳۴۸، ۳۶۰ -

[2] :- فرشتہ ۲ صـ ۸۳

[3] :- شیرازی ورق صـ ۱۷، تا ۷۵

[4] :- زبیری صـ ۳۶۰

Marfat.com

تو مہتر نائیرکاں نے اس کے جواب میں بڑی بے اعتنائی برتی اور بیٹھ کر ہی جواب میں ہاتھ ہلا دیا۔ اس پر مہاجن کو بُرا معلوم ہوا اور اس نے اسے بے عزتی سمجھی۔ اس بناء پر اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر کے باہر قیام کیا اور شہر کے اندر نہ آیا اور یہ خیال کیا کہ شاید آئندہ اور زیادہ بے عزتی سہنی پڑے۔ جب سلطان کو یہ حال معلوم ہوا تو نائکوں کے سردار کو معزول کر دیا اور اپنے چند مصاحبوں کو باہر بھیجا کہ اپنی آزردہ خاطر رعایا کو منا کر لے آئیں۔ لیکن مہاجن نے جواب دیا کہ اب سلطان کی رعایا کی بے عزتی ہوتی ہے۔ ہم آزاد پیشہ تاجر ہیں۔ اس بے عزتی کو نہیں سہہ سکتے اور جس دروازے سے بے عزت ہو کر ہم نکل آئے، اب اس دروازے سے پھر نہیں جائیں گے۔ اس پر سلطان نے حکم دیا کہ فصیل توڑ کر راتوں رات ان کے لئے ایک دروازہ بنا دیا جائے۔ اس کے بعد اس نئے دروازے سے یہ چند افراد رعایا اپنی عزت کی ضمانت حاصل کر کے داخل ہو گئے۔[1]

عادل شاہی نظام عدل گستری کی خصوصیتیں

(۱) صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کے علیحدہ علیحدہ عہدے تھے اور بعض دفعہ دو علیحدہ اشخاص ان عہدوں پر فائز رہے۔ اکثر دونوں عہدوں پر ایک ہی شخص مامور رہا۔ اس طرح بہمنیوں کی بجائے سلطنت دہلی کی پیروی ہوئی۔ (۲) بیجاپور میں دو صدر وقت واحد میں ملتے ہیں۔

(۳) سلطنت دہلی یا بہمنیوں کی نسبت بیجاپور میں صوبہ جاتی انتظام اور خاص طور پر دیہی نظم و نسق پر زیادہ توجہ ہوئی۔

(۴) عدلیہ کا قابو نسبتاً کم معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مصطفیٰ خان اردستانی نے معمولی خطا پر کئی آدمیوں کو مار ڈالا تو عدلیہ یا سلطان کی طرف سے کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔

(۵) رعایا کی انفرادی آزادی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور کوئی عہدہ دار کسی فرد مملکت کی کسی طرح بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک تاجر کے سلام کے جواب میں اگر کوئی امیر یا عہدہ دار بے اعتنائی کرے تو اسے تنبیہ و تادیب کی گئی۔

(۶) غیبت اور نائب غیبت کے نئے عہدے ملتے ہیں اور ایک جاسوسی کا محکمہ بھی ملتا ہے۔

(۷) حاجبوں سے زیادہ تر سفارتی کام لیا گیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو زبیری ص ۳۲۸ - ۳۲۹

Marfat.com

قطب شاہی نظام عدل گستری

سلطنت گولکنڈہ کا بانی سلطان قلی ہے۔ یہ دراصل ہمدان سے آیا تھا اور ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کی یادگار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سلطان قلی پر ترکستان اور ایران کے اثرات بھی تھے۔ لیکن غور کیا جائے تو قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ قطب شاہی دوسری دکھنی سلطنتوں کی طرح بہمنی سلطنت کے حلقہ بگوش اور خوشہ چین تھے۔ ان کی معاشرت و سیاست نیز ان کا نظام حکومت سب بہمنیوں کا ورثہ ہے۔ لیکن قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں رنگ دیا اور بقول پروفیسر مجید صدیقی "اپنے آپ کو تلنگانے کی قومی اور جغرافی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد قطب شاہی سلطنت ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی[1] اور آندھرا دیش کے باشندے اس کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے۔

قطب شاہوں کا تصور عدل اور شرع اسلام :-

دوسرے مسلمان حکمرانوں کی طرح قطب شاہ بھی خود عدالتی فرائض انجام دیتے تھے اور عدلیہ کے کام کے لئے عہدہ دار مقرر کرتے تھے۔ بعض سلاطین تو مذہب کے بہت پابند تھے اور بقول مصنف تاریخ قطب شاہی محمد قطب شاہ کے عہد میں احکام

---

[1] پروفیسر مجید صدیقی: تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء ص ۲۵۳ -

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۲۵۴ -

Marfat.com

شریعت پر بہت عمل ہوتا تھا[1] محمد قطب شاہ خود بڑا عالم و فاضل تھا اور جب اس نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تو اس وقت معلوم ہوا کہ ساری عمر اس نے نماز تہجد قضا نہیں کی[2] اس کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ جامع مسجد میں جہاں متعدد علما و فضلا موجود تھے کسی واعظ کی غلط تقریر پر اس نے نکتہ چینی کی اور خود اتنی بلیغ اور جامع تقریر کی کہ تمام علما و فضلا دنگ رہ گئے[3]

قطب شاہوں کے تصور عدل کے مطالعہ میں سب سے پہلے ان خیالات کو دیکھنا چاہیئے، جو دوسروں نے ان کے عدل و انصاف کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ بانی سلطنت سلطان قلی کے متعلق صاحب تاریخ قطب شاہی نے لکھا ہے کہ "از مین معدلتش جہان و جہانیاں در مہاد امن و امان مرفہ الحال و فارغ البال غنودہ زندگانی می نمودند"[4] ابراہیم قطب شاہ میں قہر و غضب کا مادہ زیادہ تھا اور معمولی جرم پر وہ سخت سزائیں دیتا تھا۔ لیکن ابراہیم کا قہر و غضب زیادہ تر چوروں رہزنوں اور مفسدوں کے ساتھ تھا اور اسی کا اثر یہ تھا کہ ملک چوروں اور مفسدوں سے محفوظ تھا[5] مصنف تاریخ قطب شاہی نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے متعلق زبان روزگار سے یہ شعر نکلتا تھا کہ

جمال بخت زروی ظفر نقاب انداخت
کمال عدل بفریاد دادخواہ رسید[6]

ابراہیم کے بعد سلطان محمد قلی اور سلطان محمد قطب شاہ بڑے انصاف پسند حکمران تھے[7]

---

[1] تاریخ قطب شاہی مخطوطہ محولہ صدر ص ۱۸۶ ۔ حدیقۃ العالم حصہ اول محولہ صدر ص ۲۸۳ ۔
[2] حدیقۃ العالم حصہ اول ص ۲۸۴ ۔
[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۲۸۵ ۔ ۲۸۹ ۔
[4] تاریخ قطب شاہی ص ۴۶ ۔
[5] فرشتہ ۲ ص ۱۷۰ ، حدیقۃ العالم حصہ اول ص ۱۱۶
[6] تاریخ قطب شاہی ص ۱۸
[7] پروفیسر مجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ ص ۲۶۲

Marfat.com

سلطان محمد کے بعد عبداللہ بھی ایک عادل سلطان نظر آتا ہے جس کے عدل و انصاف کی صاحب حدیقۃ السلاطین نے بڑی ستائش کی ہے[1] سلطان عبداللہ کے عدالتی انتظام کی خود باہر کے سیاح بھی تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ تھیونو لکھتا ہے کہ "عبداللہ قطب شاہ بہت انصاف پسند ہے۔ وہ بذات خود عدل گستری میں دلچسپی لیتا ہے اور امرا بھی سزا سے نہیں بچتے"[2]

محکمہ عدلیہ

گو قطب شاہیوں نے گولکنڈے میں اپنے پیش بہا تمدنی آثار چھوڑے۔ مملکت کا ایک اچھا نظم و نسق قائم کیا اور عدلیہ کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ گولکنڈے کا عدالتی انتظام سلطنت بہمنی کے برابر نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو بہمنیوں کے عدالتی نظم و نسق کے مقابلہ میں گولکنڈہ کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بہمنی نظام عدل گستری کے مطالعہ میں دیکھا جا چکا ہے، مرکزی حکومت میں صدر جہاں یا محکمہ عدلیہ کا اعلیٰ ترین حاکم و ذمہ دار بھی تھا۔ بہمنیوں کا صدر جہاں مرکز میں ایک وزیر تھا اور مرکزی حکومت میں اپنی آواز رکھتا تھا۔ لیکن گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت میں عدلیہ کے حاکموں کو شاید اتنی وقعت نہیں دی گئی۔ گولکنڈے کی تاریخ میں ایسی بھی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ سلاطین اپنے کو اسلامی قانون کا پابند سمجھتے یا قاضی کے فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خود سلاطین عدل و انصاف کے پابند تھے اور بطور حاکم عدالت انصاف رسانی کرتے تھے

سلطنت گولکنڈے کا پیشوا جو سلطان کا نائب اور سلطان کے بعد مملکت کا اعلیٰ ترین عہدہ دار تھا، اپنی اس حیثیت کے لحاظ سے عدلیہ سے بھی متعلق رہا لیکن بعض شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر جملہ کو جو بعض دفعہ کافی وسیع اختیارات استعمال کر لیتا تھا، عدلیہ کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ چنانچہ ٹیورنیر نے لکھا ہے کہ جب وہ میر جملہ سے ملنے گیا تھا تو اس کے سامنے میر جملہ نے بعض ملزموں کی تحقیقات کی اور ان کو سزا دی[3]۔ ٹیورنیر کے اس بیان کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب سلطان محمد قلی نے مرزا محمد امین کو میر جملہ بنایا تو اس نے "در تمہید قواعد عدل و انصاف و استیصال اصول جور و

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۱۳۱۔

[2] تھیونو جلد سوم محولہ صدر ص ۹۷۔

[3] ٹیورنیر ص ۲۳۳-۲۳۴۔

اعتساف بغایت کو شید ۱؎

شاید یہی وجہ ہے کہ جب گولکنڈے کے آخری تاجدار ابوالحسن نے مادنا کو وزیر و پیشوا بنایا تو اس نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کئے ۲؎۔ ان کی ذلت کی اور ان کی شکایتوں کی دادخواہی نہیں ہوتی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو گولکنڈے کا یہ آخری وزیر عدلیہ پر بھی اتنا چھا گیا تھا کہ ایک دفعہ غبن کے الزام میں خود اپنی ایما پر ایک سید کے ہاتھ کٹوا دیئے ۳؎ منوچی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک روز ندی کے کنارے کوئی ایرانی منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک ہندو آیا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس طرح کپڑے دھونے لگا کہ اس پر پانی اڑنے لگا ایرانی نے دور ہٹنے کو کہا تو اس پر تکرار ہو گئی اور بہت سے ہندو جمع ہو کر ایرانی کو مارنے لگے اور اسے گرفتار کر کے مادنا کے پاس لے گئے۔ مادنا نے ایرانی کے ہاتھ کٹوا دیئے بالآخر اس مظلوم نے دیکھا کہ اس کی کوئی دادرسی نہیں ہوتی کیوں کہ حکومت اور عدالتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لئے کٹے ہوئے ہاتھ کو تیل میں سکھا کر وہ اورنگ زیب کے دربار میں پہونچ گیا۔ جہاں شہنشاہ نے اس کو دلاسا دیا اور روپیہ سے مدد کر کے اس کا وعدہ کیا کہ اس کا انتقام لیا جائے گا ۴؎

محکمہ قضاء کے عہدہ دار

قطب شاہیوں کے محکمہ عدلیہ سے متعلق جو بھی مواد ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہیوں کے ہاں صدر جہاں بھی ہوتا تھا ۵؎ چنانچہ نواب علامی شیخ محمد کو بھی یہ عہدہ دیا گیا تھا ۶؎ لیکن اس عہدہ دار کے فرائض اختیارات یا طریقہ کار سے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں قاضی القضاۃ نظام الدین عبدالملک کا نام

۱؎ حدیقۃ العالم صہ ۲۴۴۔

۲؎ ۔ تفصیل کے لئے پروفیسر مجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ صہ ۲۰۰ تا ۲۰۰

۳؎ ۔ خافی صہ ۳۱۱۔

۴؎ ۔ منوچی جلد ۳ صہ ۱۳۱۔۱۳۲۔

۵؎ حدیقۃ السلاطین مولوی صدر صہ ۱۲۳۔

۶؎ " " " " "۔

Marfat.com

ملتا ہے۔ لیکن اس عہدہ سے متعلق بھی کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ قطب شاہی دور میں قاضی محمد سمنانی اور عمدۃ الفضلا قاضی احسن مشہور قاضی مکہ معظمہ اور قاضی عطاء اللہ کا نام ملتا ہے۔ لیکن ان قاضیوں کے فرائض یا طریقہ کار سے متعلق قطب شاہی تاریخیں خاموش ہیں۔ البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان قاضیوں سے سلاطین نے عدلیہ کے علاوہ دوسرے اہم کام بھی لیے۔ مثال کے طور پر سلطان عبداللہ کے عہد میں قحط پڑا تو قاضی احسن نے جو علامہ روزگار تھے نماز استسقاء پڑھائی۔ سلطان عبداللہ نے قاضی عطاء اللہ کو بطور حاجب کے بیجاپور روانہ کیا تھا اور ان کو فوج کی بھی رہنمائی کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح سلطان محمد قطب شاہ کی لڑکی جب محمد عادل شاہ سے بیاہی گئی تو مجلس عقد میں علماء و فضلا کے علاوہ قضاۃِ ملک بھی تھے۔ اور سلطان نے شہزادی کے جلوس میں جانے کے لئے دیگر علماء، فضلا اور مشائخ کے علاوہ قاضی احسن کو بھی حکم دیا تھا۔

صدر جہاں قاضی القضاۃ اور قاضیوں کے علاوہ حاجب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ہندؤں کے معاملات میں فصل خصومات کے لئے پنڈتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن محتسب مفتی باربک وغیرہ کا قطب شاہی تاریخوں میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ پیشوا امیر جملہ دبیر اور کوتوال کا جو محکمہ عدلیہ سے کسی نہ کسی طرح متعلق تھے۔ اسی باب میں عام نظم و نسق کے تحت ذکر کر دیا گیا ہے۔

عدالتیں

مختلف واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین خود داد رسی کرتے تھے اور اس کو عدالت سلطانی کہنا چاہیئے۔ سلطان محمد قلی نے شہر حیدرآباد میں ایک نئی عمارت داد محل کے نام سے بنائی تھی جہاں بیٹھکر سلاطین مظلوموں کی فریاد سنتے۔ داد محل کے دروازے بازار کی طرف کھلتے تھے اور یہ عام حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو وہ بلا مزاحمت بادشاہ کے سامنے آجائے۔ یہ شاہی داد رسی ہر عہد میں جاری رہی۔ ٹیورنیر نے اپنی آنکھوں سے شاہی عدل گستری کا انتظام دیکھا تھا وہ کہتا ہے کہ بادشاہ کی داد رسی کا طریقہ یہ ہے کہ بادشاہ محل کے برآمدے پر آتے ہیں سب لوگ ان کے سامنے میدان میں اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے کھڑے رہنے کا انتظام یہ ہے کہ زمین میں لکڑیاں نصب کر کے رسیوں کی تین قطاریں باندھی جاتی ہیں۔ اور یہ قطاریں پورے میدان میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان

لہ: حدیقۃ العالم ص ۱۸۰، ۱۹۱؛ تاریخ قطب شاہی، ص ۱۵۰۔

سہ پروفیسر حمید صدیقی تاریخ گولکنڈہ ص ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴۔

میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور بغیر طلب کے کوئی رسیوں کو پھاند کر نہیں جا سکتا۔ شہ نشین کے سامنے ایک راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس میں سے دادخواہ بادشاہ کے سامنے جاتے ہیں۔ یہاں بھی سامنے ایک رسی ہوتی ہے۔ جب کسی کو بلایا جاتا ہے تو دو آدمی شہ نشین کے سامنے کی رسی نیچے جھکا دیتے ہیں۔ تاکہ دادخواہ بادشاہ کے سامنے پہنچ جائے۔ ایک وزیر برآمدے کے نیچے کھڑا ہوتا ہے اور عرائض لیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانچ چھ عرائض جمع ہو جاتی ہیں وہ ان کو ایک تھیلی میں رکھ دیتا ہے جو ڈوری کے سہارے اوپر سے چھوڑی جاتی ہے۔ ایک خواجہ سرا جو بادشاہ کے برابر میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس کو اوپر کھینچ لیتا اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے[۱]

اس عدالت سلطانی کے علاوہ دارالسلطنت میں ایک عدالت دارالقضاء کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہاں شرع شریف کے بموجب مقدمات فیصل کئے جاتے تھے۔ اور چونکہ بہمنیوں کی طرح گولکنڈے میں بھی صدر جہاں قاضی القضاۃ وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قطب شاہی عدالتیں بھی بہمنی عدالتوں کی طرز کی ہوں گی۔ مرکز کی طرح صوبجاتی حکومتوں میں قاضیوں اور پنڈتوں سے فصل خصومات کا کام لیا جاتا تھا۔

جرائم اور سزائیں

دیگر مملکتوں کی طرح قطب شاہی سلطنت میں بھی سب سے بڑا جرم بغاوت تھا اور سرکشی یا بغاوت کے الزام میں موت یا اخراج کی سزا دی جاتی تھی۔ اس کے بعد قطب شاہی سلاطین چوری اور قزاقی کی بڑی سخت سزا دیتے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ "ولایت تلنگ پر از دزد و حرامی بود[۲]" اور "مردم تلنگانہ در فن دزدی از رہزناں ممالک دیگر ممتاز اند[۲]" ابراہیم قطب شاہ نے چوروں اور ڈاکوؤں کے استیصال میں بڑی سختی کی۔ اس کا حکم یہ تھا کہ چوروں کو کوڑے مار کر پیر کے ناخن جدا کئے جائیں اور برتن میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کئے جائیں[۳] اس وحشیانہ سزا کی شاید اس وقت ضرورت تھی۔ ابراہیم قطب شاہ نے تلنگانے

---

[۱] حدیقۃ العالم مقالہ ا ص ۱۱۶ ۔

[۲] " " ص ۲۰۰ ۔

[۳] فرشتہ ۲ ص ۱۷۰ ۔

Marfat.com

یہی وہی کام کیا جو بلبن نے سلطنت دہلی میں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت پُرامن ہوگئی۔ ابراہیم کے حسن انتظام کی وجہ سے چوری کا ارتکاب تو کجا کوئی چوری کا لفظ زبان پر نہ لاتا تھا جہاں کہیں جدید فتوحات ہوتیں۔ پہلے چوروں اور مفسدوں کا خاتمہ کیا جاتا۔ چنانچہ اندر کنڈے کی فتح کے بعد یہی انتظام ہوا[1] اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ بقول صاحب تاریخ قطب شاہی ایک بڑھیا سر پر طشت میں زر و زیور رکھ کر اکیلی احمد نگر اور بیجاپور کی سرحد تک جا سکتی تھی[2]

تھیونو ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک امیر نے ایک حرافہ کو محل میں بند کر کے اس سے زبردستی پانچ ہزار روپیہ وصول کر لئے۔ اس کی اطلاع ہوتے ہی بادشاہ نے اس کو سزا دی اور رقم واپس کرا دی[3] ایک عہدہ دار ایلچی بیگ نے تاجروں سے قرض لیا تھا اور ادا نہیں کرتا تھا۔ تاجروں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی تو عبداللہ نے تیس یا چالیس ہزار ہون اس کی آمدنی سے ادا کر دیئے اور جو باقی رہ گئے تھے، وہ شاہی خزانے سے ادا کئے[4]

اس موقع پر ایک دلچسپ چیز کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جو ٹیورنیر نے بیان کی ہے۔ ٹیورنیر نے لکھا ہے کہ جب وہ اور اس کا ساتھی میر جملہ کے پاس گئے تو میر جملہ متعدد ملزموں کی تحقیقات میں مصروف تھا۔ گولکنڈے کا یہ رواج ہے کہ ملزم کو قید میں نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے فوراً حاکم مجاز کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے جو شہادت وغیرہ سننے کے بعد اسے سزا دیتا یا بری کر دیتا[5] اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میر جملہ کو بھی عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ نیز یہ ایک نیا اصول ملتا ہے کہ ملزم کو فوراً حاکم کے پیش کرنا چاہیئے۔

ٹیورنیر ایک اور عجیب و غریب چیز بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ایک دن وہ میر جملہ سے ملنے کے لئے گیا تو میر جملہ کے سامنے چار ملزم لائے گئے تھے۔ میر جملہ نے ان سے سوالات

---

[1] پروفیسر مجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ صہ ۸۹۔

[2] تاریخ قطب شاہی صہ ۱۳۷۔ حدیقۃ العالم محولہ صدر صہ ۱۹۹۔

[3] تھیونو جلد ۳ صہ ۹۷۔

[4] پروفیسر مجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ صہ ۲۶۳۔

[5] ٹیورنیر صہ ۲۳۳۔

گئے اور انہوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ ان میں سے ایک کا جرم تو یہ تھا کہ اس نے ایک گھر میں گھس کر ایک عورت اور اس کے تین بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ میر جملہ نے اس کے ہاتھ پیر کٹوا دیئے اور ایک شاہراہ پر اس نے ڈلوا دیا۔ دوسرے نے شاہراہ پر چوری کی تھی۔ اس کے متعلق حکم ہوا کہ اس کا پیٹ چیر کر کسی موری میں پھنکوا دیا جائے۔ دوسرے دو ملزموں کے متعلق ٹیورنیر لکھتا ہے کہ ان کا جرم اسے معلوم نہ ہو سکا لیکن دونوں کے سر اڑا دیئے گئے[1]

اگر میر جملہ کو اس طرح سزا دینے کے اختیارات حاصل تھے تو ٹیورنیر کے بیان سے ہمارے سامنے یہ ایک دلچسپ مسئلہ آ جاتا ہے کہ قطب شاہی دور میں سزا کس لحاظ سے دی جاتی تھی۔ سر کاٹنے اور ہاتھ پیر کاٹنے کی سزا تو ممکن ہے حد شرعی کے نفاذ سے تعلق رکھتی ہو لیکن پیٹ کاٹ کر موری میں پھنکوانے کی سزا قطعی طور پر اسلامی حد کی سزا نہیں ہے۔ اگر ٹیورنیر کے بیان پر بھروسہ کیا جائے۔ تو ہمارے سامنے اسلامی تعزیرات اور "حد" کی سزاؤں میں ایک نئی نظیر پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس واقعہ کو پیش نظر رکھا جائے کہ ٹیورنیر کو اس کے جواہرات نہ بکنے کا افسوس تھا اور قطب شاہ سے ناراض ہو کر وہ حیدرآباد سے گیا تھا[2] تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے میر جملہ کے خلاف دل کا غبار نکالا اور اس پر وحشیانہ سزاؤں کا الزام لگایا ہے۔

قطب شاہی نظام عدل گستری کی خصوصیتیں:۔

(۱) قطب شاہوں نے تلنگانہ کے ماحول میں اپنی سلطنت کو ایک آندھرائی حیدرآبادی بنا دیا۔ مقامی رسم و رواج بھی مملکت کے قانون میں جگہ پانے لگے۔

(۲) ہندوؤں کو عام نظم و نسق کے علاوہ عدلیہ کے نظم و نسق میں بھی عمل دخل دیا گیا۔ دور ہندوستان کی پہلی اسلامی حکومت میں تو ہندوؤں سے مشورہ اور مدد لی گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ مختلف سلطنتوں میں ہندوؤں کو ثانی جگہ ملتی گئی اور بالآخر قطب شاہی سلطنت نے ہندوؤں کی ایسی سرپرستی کی کہ شاید کسی اور سلطنت میں ہندوؤں کو اتنے مواقع نصیب نہ ہوئے۔

(۳) ایک خاص بات قطب شاہوں کے ہاں یہ نظر آتی ہے کہ مملکت کے بڑے عہدوں پر سب شیعہ لوگ مامور ہوئے اور بڑے اور ذمہ دار عہدے ہندوؤں کو بھی دیئے گئے۔

---

[1]:۔ ٹیورنیر صہ ۲۳۴ — [2]:۔ ملاحظہ ہو ٹیورنیر صہ ۲۴۳۔ ۲۴۵۔

(۴) پیشوا کا عہدہ سب سے اہم تھا اور نائب شاہ کی حیثیت سے پیشوا عدلیہ سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ لیکن میر جملہ بھی عدالتی اختیارات استعمال کرنے کا مجاز تھا۔

(۵) جاسوسی کا ایک باضابطہ محکمہ قایم ہوا جو دکن کے لئے ایک نئی چیز تھی۔

(۶) انگلستان کے سے بیس کا رپس کے اصول کی طرح گولکنڈے میں یہ رواج تھا کہ ملزم کو قید میں نہیں رکھا جاتا بلکہ گرفتاری کے بعد فوراً حاکم مجاز کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ اور یہ قطب شاہی مملکت کی خاص چیز تھی۔

(۷) عدلیہ یا قاضیوں کی اتنی وقعت یا حیثیت نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ مثلاً سلطنت دہلی یا سلطنت بہمنی میں تھی۔

(۸) گو حد کی سزائیں نافذ رہیں۔ لیکن اسلامی تعزیری سزاؤں میں کافی تبدیلی کی گئی اور بعض نئی حدیں بھی ہوئیں۔

(۹) مظلوموں کے لئے ایک پناہ گاہ یعنی "امان محل" بنایا گیا تھا۔

لہ ملاحظہ ہو ٹیورنیر ص ۲۴۳ تا ۲۴۵۔

Marfat.com

Marfat.com

گزشتہ ابواب میں جو بھی مواد پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) اسلامی مملکت کے تصور میں اخلاقی تزئین کو مادی منفعت پر ترجیح دی گئی ہے سیاسیات کو اخلاق کے تابع قرار دیا گیا ہے اور مملکت کا مقصد یہ ہے کہ افراد مملکت کے اخلاق سنوارے۔

(۲) اسلامی مملکت میں عالمگیر تصور پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر قوم اور نسل اور آبادی بلا امتیاز رنگ و نسل سما سکتی ہے۔ یہ مملکت جغرافی اور نسلی حدود سے بالاتر ہے۔ اسی لئے مملکت یا سلطنت کی اصطلاح اس پر کسی طرح منطبق نہیں ہو سکتی بلکہ "امت" کی اصطلاح منطبق ہوتی ہے۔ اور اس میں اسلامی اخوت پوشیدہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وسطی دور کے آخری زمانے میں چھوٹی چھوٹی جغرافی وحدتیں عملاً پیدا ہو گئیں لیکن ان کا وجود اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف تھا۔

(۳) اقتدار اعلیٰ کا ماخذ ربانی ہے۔ لیکن یہ اقتدار انسانوں کو بطور عطیہ ربانی ملا ہے۔ مشیت عامہ میں یہ اقتدار منتقل ہو گیا۔ اس لئے تعملی دائرے میں یہ اقتدار انسانی جامے میں ظاہر ہوتا ہے۔

خلافت یا حکومت کے اعضاء میں خلیفہ اور اس کی مجلس عاملہ، مقننہ یعنی فقہاء اور عدلیہ یعنی قضاۃ شامل تھے۔ اسلامی حکومت کے یہ تینوں اعضاء معین تھے اور ایک دوسرے کے اختیارات میں مداخلت نہیں ہوتی تھی۔ گویا تفریق اختیارات کا یہ تصور مانٹسکوے سے ایک ہزار سال پہلے امت مسلمہ میں پیدا ہو چکا تھا۔

(۴) اسلام سے قبل عرب میں جرائم کی سخت سزائیں تھیں۔ چوروں کے ہاتھ کاٹنا سرقے کی عام سزا تھی

زانیوں کو سنگسار کیا جاتا یا ان کے چہرے سیاہ کئے جاتے اور پھر ان کو کوڑے لگائے جاتے۔ معمولی مضرتوں کے لئے خون بہا طلب کیا جاتا تھا۔ مدعی سے ثبوت طلب کیا جاتا اور مدعی علیہ کو حلف دی جاتی تھی۔

انصاف رسانی کے تین طریقے تھے۔ (الف) فصل خصومات کے لئے قبیلہ واری پنچ مقرر ہوتے تھے اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ جرم کو "دفن" کر دیا جائے تاکہ انتقام کا جذبہ ابھرنے نہ پائے (ب) پیچیدہ مقدمات کاہن کے پاس پیش ہوتے تھے جو مذہبی پیشوا یا علم غیب کے مدعی سمجھے جاتے تھے۔ فیصلوں کو تعمیل کے لئے کوئی عاملانہ طاقت نہ تھی۔ مرافعہ کا طریقہ کار نہ تھا (ج) "تحکیم" کا ایک ادارہ تھا۔ ثالث یا حکم معاملات کا تصفیہ کرتے۔

اس موقع پر "حلف الفضول" کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ ایک اجتماعی حالف تھا یعنی یہ ایک رضاکار جماعت کا سمجھوتہ تھا کہ شہری حدود میں جو مظلوم پائے جائیں ان کی مدد کی جائے اور ظالم کو سزا دی جائے۔ آنحضرت صلعم قبل نبوت اس کے رکن تھے۔ نبوت کے بعد بھی آپ نے اس جماعت میں حصہ لیا۔ یہ رضاکار جماعت اموی دور کی ابتدا تک کام کرتی رہی۔

بعض طاقتور قبیلے ایسے تھے۔ جو اپنے رکن قبیلہ کا خون بہا معمولی قبیلے کے رکن سے دگنا لیتے تھے۔ آزاد شخص کا قاتل غلام ہو تو غلام کے علاوہ مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر بدل میں طلب کیا جاتا تھا۔

غلام کے قتل پر آزاد قاتل سے کمتر معاوضہ لیا جاتا تھا۔ اگر عورت مقتول ہوتی تو بھی اسی قاعدے پر عمل ہوتا تھا۔ اس قاعدے کو اسلامی دور میں قرآن نے بالکل منسوخ کر دیا (۲:۱۷۸)

زمانہ جاہلیت میں کسی مرکزی حاکم عدالت کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ وکیل وغیرہ نہ تھے۔ فریقین بذات خود انصاف چاہتے تھے۔ اس عدل گستری کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ تہدید صرف رائے عامہ پر موقوف تھی اور جب ملزم قبیلے کی دسترس سے باہر ہوتا تو اس کے خلاف صرف یہ چارہ کار تھا کہ ذات باہر یعنی "طرد" کر دیا جائے۔

(۵) زمانہ اسلام میں انصاف متفرد کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ پوری ذمہ داری حکومت کا فرض قرار دیا گیا۔ عدل اور احسان کا حکم دیا گیا۔ کسی کے ذاتی بغض و مخالفت کی وجہ سے ناانصافی ناجائز قرار دی گئی۔ رشتہ داری یا قرابت کے تمام اعتبارات منسوخ قرار دیئے گئے۔ ذاتی خواہش کی پیروی ممنوع قرار دی گئی۔ عدل خص راست بازی اور پرہیزگاری کا تقاضا

Marfat.com

منصور ہونے لگا۔ گواہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اگرچہ اس میں قرابت داروں یا ماں باپ کا نقصان ہی کیوں نہ ہو نا ہو۔

کسی مسلمان کا قتلِ عمد سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا البتہ مقتول کے ورثاء فدیہ لے کر قصاص معاف کر سکتے ہیں۔ آنحضرت صلعم بہ نفس نفیس ہر قسم کے تنازعات میں آخری فیصلہ کے مجاز تھے۔

انفرادی انتقام کی جگہ عدل گستری کا ایک مرکزی ادارہ قائم ہو گیا۔ نہ صرف افراد بلکہ قبیلوں سے بھی یہ حق چھین لیا گیا اور یہ اختیار حکمران وقت کے ہاتھ میں آگیا۔ جو تحقیق اور غیر جانب داری کا پابند تھا۔ غیر مسلموں کے مقدمات ان کے شخصی قانون کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ غیر مسلموں کے تعلق سے بھی آنحضرتؐ کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جانے لگا۔

مستقر مدینہ میں ہر قبیلہ کے عریف، نقیب، مفتی اور قاضی ابتدائی عدالت کے فرائض انجام دیتے تھے اور انتہائی عدالت مرافعہ خود جناب رسالت صلعم کی ذات تھی۔ صوبوں اور قلعوں میں عامل یعنی گورنر سپہ سالاری اور مالی فرائض کے علاوہ قاضی اور محتسب کا کام بھی کرتے تھے۔ اور ان کی کارروائیوں کے خلاف آنحضرت صلعم کے پاس مرافعے آتے تھے۔

حاکم عدالت کو تاکید کی گئی کہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر کافی غور اور تحقیق کے بعد فیصلہ کرے۔ عدل گستری انسانی فرائض میں داخل ہو گئی۔ انصاف رسانی کے لئے معاوضہ لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ کھلی عدالتی کارروائی پر زور دیا گیا۔ انصاف کا یہ تصور کیا کہ عدل گستری مفت ہونی چاہیئے، جرمی بنتھم سے صدیوں پہلے اسلامی مملکت میں عمل میں آچکا تھا۔

(۶) قانون، قرآن اور حدیث کا مجموعہ ہے۔ اس قانون سازی کے ذریعہ جو احکام مقرر ہو گئے تھے ان کے فقیہ، مجتہد، قاضی سب ہی پابند تھے۔ لیکن اجتہاد، صواب دید اور استحسان یا نصفت کے ذریعہ اس قانون میں لچک پیدا کر دی گئی۔ اس طرح اسلامی دور میں بہتیری نئی شکلیں پیدا کر دی گئیں۔ مثلاً عمد، شبہ عمد اور خطا میں فرق کیا گیا۔ اس میں نیت کا بڑا عنصر شامل کیا گیا۔ معاملات اور جرائم کی ذمہ داری صرف انسانوں پر عاید کی گئی اور دیگر مخلوقات اس سے بری سمجھی گئی۔ ورنہ زمانہ جاہلیت میں جانور، معدن، اور کنوؤں پر بھی ذمہ داری عاید ہوتی تھی۔ انصاف کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے سب برابر کر دیئے گئے۔ خود آنحضرتؐ نے اپنے خلاف مقدمات کی سماعت فرمائی اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر فرمائے۔ اس اسلامی اصول اور آنحضرتؐ

Marfat.com

کے طرزِ عمل سے اسلامی عدلیہ کی جو اہمیت پیدا ہوئی، وہ بہت قابل قدر ہے۔ افلاطون کے الفاظ میں اس کو "عدل مطلق" کہنا چاہیئے۔ عہدِ خلافت راشدہ کی بھی کئی نظیریں موجود ہیں۔ خلفاء راشدین اپنے خلاف فیصلے سننے کے لئے قاضی کے روبرو حاضر ہوتے تھے۔ اموی اور عباسی دور کے بہت سے خود سر بادشاہ بھی اس قاعدے پر عمل کرتے رہے اور یہی طریقہ مصر، اسپین اور ہندوستان میں باقی رہا۔

(۷) آنحضرتؐ نے عدل گستری کا یہ بنیادی اصول قرار دیا کہ بغیر ثبوت کے کسی دعوے کو صحیح نہیں مانا جا سکتا چنانچہ حدیثوں میں امورِ تنقیح طلب اور پیش شدہ شہادت کی جانچ کے لئے بہت سے احکام ملتے ہیں۔ مثلاً قاضی کا فرض ہے کہ روبرو مقدمہ پر فیصلہ صادر کرے اور اس میں اپنی ذاتی معلومات کو دخل نہ دے فریقین کا بیان سننے کے بعد فیصلہ کیا جائے۔

سرکارِ دو عالمؐ نے عدالت کا یہ اہم ضابطہ مقرر فرمایا کہ بارِ ثبوت مدعی پر ہے اور مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے تو مدعی علیہ کو حلف دی جائے۔ مدعی علیہ کے پاس جوابی ثبوت نہ ہو تو مدعی حلف کے ذریعہ اپنے ناقص ثبوت کی تلافی کر سکتا ہے۔ جب کبھی دو گواہ ضروری قرار دیئے جائیں لیکن ایک سے زیادہ گواہ پیش نہ ہو سکے تو حلف پر فیصلہ کیا جائے۔

ایسے مقدمات میں جہاں ماہرین کی رائے ضروری تھی۔ مثلاً تعمیرات، زراعت وغیرہ تو آنحضرتؐ ماہرین کی رائے پر فیصلہ فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی ماہرین کی رائے کو اہمیت دی گئی۔

فوجداری مقدموں میں ختمِ تحقیقات تک ملزم کو اور قرض کی ادائی تک مدیون کو حوالات میں رکھا جاتا تھا۔ نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیا جاتا تھا۔

(۸) اسلامی قانون اور عدل گستری کے لئے دو تہدیدیں تھیں۔ ایک تو حکومت کی طاقت دوسرے احکامِ خداوندی کی عظمت۔

(۹) حجۃ الوداع میں عرفات میں جبل الرحمۃ کے خطبہ میں سرکارِ دو عالمؐ نے انسانوں کے تین بنیادی حقوق قرار دیئے تھے۔ جان، مال اور آبرو۔ نیز یہ فرمایا تھا کہ امانت اور قرض واپس کئے جائیں، سود ممنوع ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جو قتل و خون ہوئے تھے، وہ اب فراموش کر دیئے جائیں اور لوگ انتقام کا خیال نہ کریں۔ قتل عمد میں قصاص اور شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا لیا جائے۔ گویا شبہ عمد دیوانی نوعیت کی خلاف ورزی تھی۔ اور خود قتل عمد میں

Marfat.com

دیوانی مضرت کا پہلو ہے۔

۱۰۱) عہد نبوی کے بعض صیغہ جات یہ تھے۔

(الف) قضاءت (ب) احتساب (ج) مصالحت (د) جمع صدقات (ہ) پولیس (و) جلاد۔

(۱۱) خلافت راشدہ :-

قرآن اور حدیث ہی مملکت کا دستور تھا۔ اجماع کے اصول سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اور اجتہاد سے کام لیا گیا۔ عدل گستری کے لئے قاضی مقرر تھے جن کو خلیفہ مامور کرتے تھے۔ بعض دفعہ گورنروں کو بھی قاضی کے تقرر کا اختیار دیا گیا۔ قاضی عامل سے آزاد رکھے گئے تھے۔

عہد صدیقی | مدینہ میں خلیفہ فصل خصومات کرتے۔ دوسرے علاقوں میں عامل عدلیانہ فرائض انجام دیتے تھے۔

عہد فاروقی | خلیفہ وقت مجلس شوریٰ یعنی کونسل میں بحث طلب امور پیش کرتے تھے۔ ملکی نظم ونسق کے مسائل اس مجلس میں پیش ہوتے تھے اور بغیر مشورے اور کثرت رائے کے کوئی امر طے نہیں ہوتا تھا۔ اہم معاملات میں مہاجرین اور انصار کا عام اجلاس ہوتا اور سب کے اتفاق سے مسائل طے پاتے۔

صوبوں اور ضلعوں کے حاکم عموماً مقامی باشندوں کے انتخاب پر مقرر ہوتے تھے۔ کسی حاکم سے مقامی آبادی ناراض ہوتی تو اس کو معزول کر دیا جاتا۔ عدلیہ کو عاملہ سے الگ رکھا گیا۔ ہر صوبہ میں حاکم صوبہ یا والی، کاتب یعنی میر منشی، کاتب دیوان یعنی دفتر فوج کا منشی صاحب الخراج یعنی کلکٹر، صاحب احداث یعنی پولیس کا عہدہ دار، صاحب بیت المال یعنی افسر خزانہ اور قاضی وغیرہ مامور ہوتے تھے۔

عہدہ داروں کے تقرر کے وقت ان کو ایک فرمانِ تقرر دیا جاتا تھا، جس میں ان کے اختیارات وفرائض کا تعین ہوتا۔ نیز عہدہ دار کے مال واسباب کی تفصیلی فہرست بھی تیار کی جاتی تھی۔ وہ اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرتا یا اس کے مال واسباب میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔

حج کے زمانے میں تمام عامل طلب کئے جاتے تھے اور فاروق اعظم رض اعلان فرماتے تھے کہ کسی شخص کو کوئی شکایت ہو تو وہ خلیفہ کے روبرو پیش کرے۔

عہد فاروقی میں عدالت ایک جداگانہ محکمہ بن گیا۔ مملکت کی صوبہ واری تقسیم کے بعد

Marfat.com

ہر ضلع میں عدالتیں قایم کی گئیں اور قاضی مقرر کئے گئے۔

فاروق اعظم نے یہ اصول بیان فرمایا کہ عامل یا قاضی کے تقرر کے وقت کسی حاکم کو اقربا پروری، دوست نوازی اور جانب داری سے کام نہ لینا چاہیئے۔ تفویض خدمت کے وقت صرف افراد مملکت کی بھلائی پیش نظر ہونی چاہیئے۔

تفویض اختیارات کے وقت قاضی کو حسب ذیل ہدایتیں کی گئی تھیں:-

(۱) عدالت میں تمام لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے (۲) بارِ ثبوت مدعی پر ہوگا۔(۳) مدعی علیہ کے پاس کسی قسم کا ثبوت نہ ہو تو اسے قسم دی جائے۔(۴) فریقین ہر حالت میں صلح کر سکتے ہیں لیکن جو امر خلاف قانون ہے، اس میں صلح نہیں ہو سکتی۔(۵) مقدمہ کی پیشی کے لئے ایک تاریخ معین ہونی چاہیئے (۶) تاریخ معینہ پر مدعی علیہ حاضر نہ ہو تو یک طرفہ فیصلہ ہوگا۔ (۷) ہر مسلمان قابل ادائی شہادت ہے۔ لیکن جو شخص سزا یافتہ ہو یا جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو وہ شہادت نہیں دے سکتا۔(۸) کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ ہونا چاہیئے۔(۹) بغیر تعجیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے (۱۰) فیصلہ کے لئے قرآن اور حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو غور و فکر سے کام لو اور پچھلی نظائر سے قیاس قائم کرو۔ کتاب و سنت اور اصول کے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کرو۔ یہ اجتہاد کام نہ دے تو اپنی رائے کو کام میں لاؤ اور اہل علم و دانش سے مشورہ کرو۔ ایسا فیصلہ کرو جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔(۱۱) مدعی اپنا حق ثابت کرنے کے لئے مہلت مانگے تو مہلت دینا چاہیئے۔ شہادت سے دعویٰ ثابت ہو تو مدعی کے موافق ورنہ اس کے خلاف فیصلہ صادر کرو۔(۱۲) کسی ... کی شہادت قابل اعتماد نہیں ہوگی۔ (۱۳) مجلس عدالت میں غرور و تکبر ظاہر نہ ہونا چاہیئے۔ اور لوگوں کو جھڑکنا نہ چاہیئے۔

حضرت فاروق اعظم نے رشوت ستانی اور دیگر ... کے لئے بہتری تدبیریں اختیار کی تھیں۔ مثلاً قاضیوں کو کافی بڑی تنخواہیں دی گئیں ... اور معزز اشخاص کا تقرر کیا گیا۔ قاضی کو تجارت کی ممانعت کی گئی۔ بعض دفعہ خود خلیفہ وقت فریق مقدمہ بن کر امتحان کی خاطر عدالت جاتے تھے۔ آبادی کے لحاظ سے قاضیوں کی تعداد مقرر تھی۔ عہدہ داروں کی لغزش پہ سخت دار و گیر کی جاتی تھی۔

مسجدوں میں عدالتی اجلاس ہوتے اور عدالت کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ عدالت کے

Marfat.com

دروازے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ حضرت فاروق اعظم نے پہلی دفعہ قید خانے بنوائے تھے قید خانوں کی تعمیر کے بعد سزاؤں میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ مثلاً متعدد دفعہ شراب نوشی کے جرم میں حد کی بجائے قید کی سزا دی گئی۔ ایک محکمہ افتاء بھی قائم ہوا اور خاص قابلیت کے لوگ مفتی کے عہدے پر مامور ہوئے۔

عہد مرتضوی | قانون شہادت کے سلسلے میں حضرت علی رضؓ نے ایک نئی اصلاح فرمائی تھی۔ جب گواہ پیش ہوں تو ان کا "تزکیہ" یعنی معتبری کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کی رائے تو پہلے سے لی جاتی تھی اور قاضی شریح گواہوں کی حیثیت اور صداقت کے متعلق مخفی طور پر تحقیقات کرتے تھے لیکن حضرت علی رضؓ نے ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا کہ جھوٹے گواہوں کا اظہار لیتے وقت دوسرے گواہوں کو عدالت سے ہٹا دیتے تھے۔

اس عہد میں بھی صدر مملکت قانون مملکت کے تابع تھا اور یہ تصور پیدا نہ ہو سکا کہ مقتدر اعلیٰ قانون سے بالاتر ہے۔

مرافعہ کے وقت اگر ضرورت سمجھی جاتی تو از سر نو تحقیقات ہوتی اور بیانات قلمبند کئے جاتے۔ سزاؤں میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی۔ مثال کے طور پر عہد مرتضوی کا ایک مقدمہ لیا جائے تو ایک شخص نے صرف نقب لگایا تھا۔ چوری نہیں کی تھی۔ حضرت علی رضؓ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ چند کوڑے لگوائے۔

شہادت پوری ہوئی تو حد کی سزا دی گئی ورنہ ملزم کو رہا کیا گیا۔ یہ اصول قرار دیا گیا کہ جھوٹی گواہی ثابت ہو جائے تو جو سزا ملزم کو دی جا سکتی تھی وہی سزا ایسے گواہ کو دی جائے گی۔

ٹاٹ کے مقدمات میں تاوان بقدر نقصان دلوایا۔ حد شرعی کے نفاذ میں موت واقع ہو جائے تو تاوان نفس نہیں ہوتا۔ ازالہ حیثیت کے مقدمہ میں حد مقرر نہیں تھی بلکہ حاکم وقت اپنی صواب دید سے تعزیر عاید کر سکتا تھا۔

(۱۲) غیر مسلم رعایا اور مستامنوں کے مقدمات ان کے شخصی قانون کے مطابق فیصل ہوتے تھے ان لوگوں کے لئے خصوصی عدالتیں قائم تھیں اور ان عدالتوں کے حکام غیر مسلم اور مستامن ہی مقرر کئے جاتے تھے۔

(۱۳) ملزم کو مقدمہ کی تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی تک حوالات میں رکھا جاتا تھا۔

فوجداری کی علیحدہ عدالت نہ تھی بلکہ تمام جرائم کے معاملات ایک ہی قاضی کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ البتہ پولیس یعنی "احداث" کی طرف سے استغاثہ ہوتا تھا۔ قاضیوں کو ہدایت تھی کہ غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کریں۔ پیچیدہ مقدموں میں مشورہ کریں۔ جھوٹے دعوے جھوٹی شہادت اور جانب دارانہ بیانات کی صورت میں سخت احتیاط سے کام لیں۔ رشوت اور سفارش کی سخت ممانعت تھی۔

(۱۴) اموی اور عباسی خلافت

قاضیوں کے تقرر اور ان کی علیحدگی کے وقت عام اعلان ہوتا تھا۔ قاضی محدود اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ مقرر ہوتے تھے۔ فرمانِ تقرر میں اختیارات کی صراحت ہوتی تھی اور قاضی ان اختیارات کے پابند ہوتے تھے۔ جو قاضی وسیع اختیارات کے ساتھ مقرر ہوتے تھے۔ ان کے حدود اختیارات بھی بہت وسیع ہوتے اور بعض مرتبہ انہیں انتظامی فرائض بھی سپرد ہوتے تھے۔ مثلاً ولی کا تقرر، موقوفہ جائداد کا انتظام، سزاؤں کا نفاذ اور تعمیل۔ وصایا اور امورِ متعلقہ کی نگرانی، ماتحت قاضیوں عدلیہ کے دیگر عہدے داروں اور شہود و امناء وغیرہ کی نگرانی۔

مرافعہ باضابطہ عدالت مرافعہ نہ تھی۔ ایک مجلس قایم تھی۔ عدلیہ کا پورا انتظام اموی دور میں "ناظر المظالم" کے تابع تھا جس کا فرض تھا کہ غلط فیصلوں کی نظر ثانی کرے۔ مجلس میں مرافعے پیش ہوتے تو خلیفہ وقت سماعت کرتے تھے۔ قاضی خلیفہ وقت سے رائے بھی طلب کرتے تھے۔ خلافت راشدہ کی طرح اموی دور میں قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ کسی مخصوص شخص کی تقلید یا پیروی نہیں کرتے تھے۔

عباسی دور غیر مسلموں کے تمام دیوانی معاملات میں ان ہی کے مذہبی پیشواؤں یا ہم مذہب حکام عدالت کو اختیار سماعت دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے دیوانی معاملات قاضیوں کے پاس پیش ہوتے۔ عباسی عہد میں قاضی القضاۃ کا نیا عہدہ قایم ہوا تھا۔

فوجداری یا تعزیری امور میں "صاحب المظالم" فصل خصومات کرتے تھے۔ فوجداری کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ "دیوان الناظر فی المظالم" تھی۔ یہی مجلس نظم و نسق اور محکمہ عدلیہ کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ اس کی صدارت خود خلیفہ کرتے تھے۔ خلیفہ کے غیاب میں کسی بڑے عہدہ دار ممتاز کو صدارت کا اختیار دیا جاتا تھا۔ اس مجلس کے دیگر ارکان میں قاضی القضاۃ، حاجب، مملکت کے بڑے معتمدین اور بعض مفتی شامل تھے۔

عدل گستری سے متعلق عام شکایتوں اور مرافعوں کی سماعت عباسی خلفاء خود کرتے تھے۔ بعد میں "صدر" کا خاص عہدہ وجود میں لایا گیا۔ جو ناظر المظالم کے اجلاس کی صدارت کرتا۔ بعض وقت وزیر تفویض بھی اس کی صدارت کرتا۔ کبھی وزیر تنفیذ یا گورنر کو خلیفہ صدارت کے لئے نامزد کرتا۔ بقول ماوردی صدر اصول نصفت کو بھی کام میں لاتا تھا۔

۱۱۶۷ء میں نور الدین محمود نے جو ایک بڑے فقیہ اور محدث بھی تھے، عدل گستری کے لئے ایک عدالت عالیہ قایم کی اور اس کا نام "دار العدل" رکھا اور تمام عدالتیں ایک جگہ قائم کیں۔ ایوان میں قاضی کا حد درجہ ادب اور احترام ملحوظ رکھا جاتا۔ امیر و غریب حاکم اور عامی سب برابر سمجھے جاتے تھے۔

(۱۵) مسلمان ہندوستان میں:

سندھ میں محمد بن قاسم کا نظم و نسق محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا اور سندھ ایک عرصہ تک اموی اور عباسی خلافت کا ایک مشرقی صوبہ بنا رہا۔ سندھ کی مقامی حکومت کی ویسی ہی تشکیل کی گئی جو خلافت کے دوسرے صوبوں کی تھی۔ جہاں تک ہندو رعایا کا تعلق تھا، فصل خصومات میں شاستر پر عمل کیا جاتا تھا اور ان مقدمات میں شرع شریف داخل نہیں کی گئی بلکہ ذمی قانون بھی ان پر عاید نہیں کیا گیا۔ دیوانی مقدمات میں ہندوؤں کی قدیم پنچایتیں ہی فیصلے کرتی تھیں۔

مسلمان جو زیادہ تر سپاہی تھے، ان کے لئے قاضی مقرر تھے اور وہ مفتی کے مشورے سے شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتے۔ عام اور سیاسی جرائم میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں تھا۔ قاضی اور مفتی کے فیصلوں کا مرافعہ گورنر کی عدالت میں ہوتا تھا۔

زمانہ مابعد کے مسلمان فاتحوں نے اسی مثال کی پیروی کی تھی۔

پنجاب کی حکومت فتح سندھ کے تقریباً تین صدیوں کے بعد غزنویوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قایم کی۔ اور اس کے بعد سلاطین دہلی نے آل سبکتگین کی دو سو سالہ حکمرانی کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا اور خود غزنویوں نے سندھ کے نظام عدل گستری کی خوشہ چینی کی۔ غزنویوں کے آخری زمانے میں لاہور ہندوستان میں شاہان غزنی کا مرکز تھا۔ یہاں غزنوی حکمرانوں نے نظم و نسق کا جو ڈھانچہ بنایا تھا۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے سندھ کے سیاسی تجربوں سے فائدہ اٹھایا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے عباسی ادارات

Marfat.com

سے بھی استفادہ کیا۔

پہلے تو سامانیوں کے توسط سے اور پھر براہ راست خلافت کے ذریعہ یہ ادارات غزنی اور لاہور پہنچے تھے۔ سلطنت دہلی کے لئے اس کے کئی نقوش باقی رہ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غزنی اور دہلی کے بہت سے ادارات ایک دوسرے کے مشابہ بلکہ مشترک معلوم ہوتے ہیں

اس دور کے نظام عدل گستری کے متعلق خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سندھ کی عرب حکومت کی طرح غزنوی حکمرانوں نے دیوانی معاملات میں خود ہندوؤں کو پنچایتوں سے کام لیا اور ہندو پنچایتوں کو فعل خصومات کا اختیار دے دیا۔ مسلمانوں کے معاملات قاضی سے متعلق رہے۔ البتہ عام اور سیاسی جرائم میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں کیا گیا۔ عدل گستری کے دوسرے معاملات میں غزنویوں نے عباسیوں کی کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ پیروی کی۔

ان غیر عربی اداروں میں جن کو غزنویوں نے بغداد سے حاصل کیا ایک عہدہ وزارت بھی تھا جس کو ایران قدیم کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ سامانی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد محمود غزنوی نے اپنی سلطنت میں اسی طرح کے وزیر مقرر کئے اور ابو العباس فضل بن احمد اس کا پہلا وزیر مقرر ہوا تھا جو سلطان کا نائب سمجھا جاتا تھا۔

(۱۶) سلطنت دہلی

شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں دہلی پر قبضہ کیا لیکن سلطنت دہلی کی ابتدا ۱۲۰۶ء سے ہوتی ہے جبکہ شہاب الدین کے انتقال پر قطب الدین ایبک ہندوستان کا خود مختار بادشاہ ہوا۔

جہاں تک حکومتی تنظیم کا تعلق ہے، مرکزی حکومت تو ترکی اور عباسی انداز کی تھی لیکن مقامی حکومتوں میں قدیم ہندوستانی نظام برقرار رکھا گیا۔ قطب الدین ایبک نے لاہور کے موجود الوقت اداروں کی خوشہ چینی کی اور غزنویوں کے بہت سے عہدہ داروں سے کام لیا۔ بلبن نے نظم و نسق کی بہت سی اصلاحات کیں اور شرع کی سختی سے پابندی کی۔ التمش اور بلبن کی حکومت میں علماء کو بہت دخل تھا۔

شمسی حکمرانوں کے بعد ۱۲۹۰ء میں خلجی خاندان برسر اقتدار ہوا۔ علاؤ الدین خلجی نے نظم و نسق کے بہت سے کامیاب تجربے کئے۔ لیکن اس نے نظم و نسق میں علما کو مداخلت کا موقع نہیں دیا

Marfat.com

اور اس کا دینوی قانون سلطان کی مرضی کا تابع تھا۔ ۱۳۲۱ء سے تغلق خاندان برسر اقتدار ہوا تو غیاث الدین نے نظم و نسق میں بہت سی اصلاحات کیں۔

عام نظم و نسق | مرکزی حکومت کی تشکیل ایسی ہوئی تھی، جیسے عباسی حکومت کی تھی۔ چنانچہ بغداد کے اہم ادارات جیسے دیوان مظالم، احتساب، اور مختلف درجہ کی عدالتیں دہلی میں قائم ہوگئیں۔ عدالتوں کے اختیارات اور فرایض عباسی قالب میں ڈھالے گئے۔ نظم و نسق کا سب سے بڑا عہدہ دار وزیر تھا۔ جس کا خاص کام مالیات کی تنظیم اور مالی محکمہ کی نگرانی تھا۔ اس کے علاوہ دیگر عہدہ دار بھی مامور ہوئے۔

قاضی ممالک محکمہ عدلیہ کا چیف جسٹس تھا، جو شرع کی پابندی کرواتا۔ فصل خصومات کے علاوہ صدر الصدور کے فرایض بھی انجام دیتا تھا۔ امیر داد قاضیوں کے فیصلوں کی تعمیل کرواتا تھا اور ملزمین اور خطاکاروں کو قاضی کے سامنے پیش کرتا تھا۔ بادشاہ مرکز میں نہ ہوتے تو اس وقت امیر داد عدالت مظالم میں مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کوتوال پولیس کا عہدہ دار تھا اور محتسب ملک کے اخلاق عامہ کی نگہداشت کے لئے مامور تھا۔ اشیاء کے نرخ اور مارکٹ کی نگرانی بھی محتسب کے سپرد تھی۔

صوبہ داری حکومت کی تشکیل ویسی ہی تھی جیسی مرکز کی ہوتی تھی۔ البتہ اس کا پیمانہ چھوٹا تھا۔ صوبوں میں گورنر یا ناظم سلطان کی نمایندگی کرتے تھے اور پورے صوبہ داری نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ اسی طرح اور محکمے بھی تھے جو مرکز کے تابع تھے۔ مثلاً مالگذاری کا انتظام دیوان کو تفویض تھا اور اس کے ماتحت افسر "سرکار" میں عامل کہلاتے تھے۔ موضع نظم و نسق کی پہلی اکائی سمجھا جاتا تھا۔ جہاں مکھیا اور محاسب متعین تھے۔ دیہات کی پنچایت سے بھی کام لیا جاتا تھا۔

یہ مرکزی اور مقامی حکومت کا مختصر سا خاکہ ہے۔ جو قطبیوں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں تقریباً یکساں طور پر موجود تھا۔

عدل | عدالتی عہدہ داروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید تھی اور قاضیوں کو خلاف شرع فیصلہ کرنے پر موت کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ التمش نے دادرسی کے لئے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگائی تھی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ عدل گستری خاطر خواہ ہو رہی ہے یا نہیں، وہ سلطنت کے دورے بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جس کسی کو کوئی مضرت پہنچے، رنگیں لباس پہنے تمام سلاطین عدل گستری کو ایک مقدس مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ انصاف کے معاملے میں

Marfat.com

بلبن نے خود اپنے رشتہ داروں یا بڑے افسروں کو بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھا۔ مثال کے طور پر بلبن کے ایک بڑے درباری امیر ملک باربک نے اپنے کسی ملازم کو مار ڈالا تھا۔ اس کی بیوہ نے بلبن سے شکایت کی تو سلطان نے ملک باربک کو بیوہ کے سامنے اس طرح قتل کروایا جیسے مقتول مارا گیا تھا۔ بلبن نے ایک خفیہ محکمہ بھی قایم کیا تھا اور جاسوسوں کے ذریعہ محکمہ عدلیہ کی خوبیاں اور خرابیاں معلوم کرتا تھا۔

ابن بطوطہ، جس کو محمد تغلق نے دلی کا قاضی بنایا تھا، بہت سے واقعات کا تذکرہ کرتا ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سخت گیر سلطان نے بھی قانون کی عظمت قایم رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ ایک دفعہ محمد تغلق پیدل چلتا ہوا قاضی کے پاس آیا اور شیخ زادہ بالی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے سلطان کو ظالم کہا تھا۔ ایک دفعہ قاضی کے سامنے بحیثیت مدعی علیہ بھی آیا اور اپنے خلاف فیصلہ سن کر خوش ہوا اور سزا قبول کی۔

کسی امیر نے قاضی کے سامنے شکایت کی تھی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلا وجہ سزا دی ہے۔ سلطان محمد تغلق قاضی کے سامنے پیدل چلتا ہوا آیا اور قاضی کو ادب سے سلام کیا۔ خلاف فیصلہ ہوا تو سلطان نے مدعی کو ہرجانہ ادا کیا۔ قاضی کو ہدایت تھی کہ سلطان عدالت میں آئے تو وہ سلطان کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہو۔ ایک اور مقدمہ میں سلطان پر کسی شخص نے بقایا رقم کا دعویٰ کیا تھا۔ سلطان فوراً قاضی کے سامنے حاضر ہو گیا اور اس کی رقم ادا کر دی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلاطین دہلی نے ایک منظم عدلیہ قایم کیا تھا۔ عدالتی تحقیقات ہوتی تھی۔ یہ اصول برقرار رہا کہ حاکم اسلام پر عدالت میں مقدمہ دائر ہو سکتا ہے اور وہ خود کسی پر مقدمہ چلا سکتا ہے۔

جب سلطان قطب الدین (۱۳۱۶ء - ۱۳۲۰ء) نے ایک نااہل شخص یعنی ضیاء الدین کو قاضی القضاۃ بنایا تو شورش ہو گئی اور قاضی اور سلطان دونوں قتل ہو گئے۔

سلاطین اپنے مشورے کے لئے مفتیوں اور مجتہدوں کو دربار میں جگہ دیتے تھے اور یہ ماہرین قانون سلاطین کو صحیح اصول اور قانون سے واقف کراتے تھے۔ محمد تغلق نے اپنے محل میں چار مفتیوں کو مامور کیا تھا جن کے مشورے سے وہ فصل خصومات کرتا تھا۔

جس طرح ابتدائی خلفائے اسلام عدالتی فیصلوں کو مانتے تھے۔ اسی طرح سلاطین دہلی نے بھی اپنے آپ کو قانون ملک اور عدالتوں کا بالکل پابند بنا دیا تھا۔ عدالتوں کو فصل خصومات

Marfat.com

میں پوری آزادی حاصل تھی۔

خاص صورتوں میں سلاطین اپنے فرامین کے ذریعہ بھی کسی قانون کی توضیح کرتے یا قاضیوں کو ہدایتیں دیتے تھے۔

قانون سازی مسلمان حکمران کو اُصولاً قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اختیار صرف اتنا ہے کہ ملک میں شرع کی پابندی کروائے۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو ترک اور ہندوستانی سلاطین نے اپنے فرامین کے ذریعہ بہت سے نئے اصول اور قوانین کا اضافہ کیا۔ گو مذہبی قانون میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ملکی نظم ونسق کے شعبوں میں جدید قوانین وضع کئے گئے اور سچ پوچھو تو خود شرعی قوانین میں بھی بعض تبدیلیاں ہوگئیں۔ اسلام کا قانون تعزیرات تو بہت متاثر ہوا۔ اور اس زمانے سے جبکہ چار فقہی مذاہب پیدا ہوئے تھے، مغلوں کے خاتمے تک اسلامی قانون تعزیرات اور سزاؤں میں بہتری تبدیلیاں ہوگئیں۔ سلاطین دہلی کے فرامین کی بدولت "قانون شاہی" بہت ترقی پاگیا۔ نیز ذمیوں سے متعلق نئے اصول اور قوانین وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے۔ ان امور میں اجتہاد کے اصول کو کارفرما سمجھنا چاہیئے۔

اسلامی حکمرانوں کو یہ حق حاصل تھا کہ سزاؤں کی تخفیف کردیں۔ خلفاء راشدین نے اس حق کے استعمال میں بہت احتیاط کی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں امیر معاویہ نے یہ حق استعمال کیا تھا۔ اور ہندوستان میں سلاطین دہلی نے تقریباً ہر قسم کے معاملات میں یہ حق استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سرقے سے لے کر قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی سزاؤں میں بھی تخفیف کردی۔

خاص صورتوں میں سلاطین عدالتِ ابتدائی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ذی اقتدار امراء کے معاملات میں سلطان کو فصل خصومات کا خاص اختیار استعمال کرنا پڑتا تھا۔ سلطان کی حیثیت اعلیٰ ترین حاکم عدالت کی تھی۔ اس حیثیت سے وہ عدلیہ کی دیکھ بھال کرتے۔ عدلیہ کے عہدہ داروں کا تقرر کرتے۔ شاہ ازگلستان کی طرح صرف سلطان ہی عدالتیں قایم کرسکتے تھے۔

محکمہ قضاء یا محکمہ عدلیہ: صدر مملکت کی حیثیت سے عدل گستری کے شعبے میں سلطان پر تین فرائض عاید تھے۔ پہلے یہ کہ وہ دین اسلام کا محافظ اور رعایا کے باہمی مناقشوں میں حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس حیثیت سے وہ دیوان قضاء کے ذریعہ داد رسی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ دوسرے وہ نظام حکومت کا صدر تھا اور اس حیثیت سے وہ دیوان مظالم کے ذریعہ داد رسی کرتا تھا۔ تیسری حیثیت یہ تھی کہ سلطان فوجوں کا اعلیٰ ترین افسر تھا اور اس حیثیت سے

خود سلطان یا اس کے سپہ سالار فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کا اجلاس کرتے تھے اور باغیوں کو سزا دیتے تھے۔

دیوان قضاء میں دو قسم کے عہدہ دار تھے۔ مفتی جو فنی اور قانونی رائے دیتے تھے دوسرے متفحص جو امور متعلقہ اور واقعات کی چھان بین کرتے تھے۔ ان کے علاوہ عاملانہ عہدہ دار اور اہل عملہ بھی تھے "امیر" اور "متصرف" کہلاتے تھے۔ تمام باغی دہلی بھیج دیئے جاتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہوتا ہے کہ گورنروں کو سخت سزائیں دینے کا اختیار نہ تھا۔ جب کبھی دارالسلطنت سے ہدایت وصول ہوتی تو باغیوں کو صوبے میں بھی سزا دی جاتی تھی۔

دیوان مظالم | یہ ادارہ ایک منظم شکل میں حضرت عثمان کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ عباسی خلفاء نے کبھی خود اس کی صدارت کی اور کبھی کسی وزیر کو ان فرائض کے لئے مامور کیا۔ دہلی میں سلطان کی عدم موجودگی میں امیر داد اس کی صدارت کرتا تھا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں وزیر ہی دیوان مظالم کی صدارت کرتا۔ سلطان امیر داد یا وزیر کو مشورہ دینے کے لئے قاضی ممالک دیوان مظالم کے اجلاس میں نشست کرتا تھا۔

دیوان قضاء | دیوانی مقدموں کی سماعت کی خاص شان تھی۔ دیوان قضاء اور محکمہ عدلیہ کا صدر قاضی ممالک ہوتا تھا۔ جس کو قاضی القضاۃ بھی کہتے تھے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں صدر الصدور کا عہدہ بھی اسی میں ضم کر دیا گیا۔ قاضی القضاۃ کی بہت بڑی تنخواہ ہوتی تھی۔ محکمہ عدلیہ اور محکمہ امور مذہبی کے تمام معاملات اسی سے متعلق تھے۔ وہ تمام ماتحت عدالتوں کے مرافعوں کی سماعت کرتا اور مقامی قاضیوں کا تقرر بھی کرتا تھا۔ دارالسلطنت میں ایک علیحدہ قاضی بھی ہوتا تھا۔

قاضی | ہر شہر اور قصبے میں قاضی مقرر ہوتے تھے۔ قاضی القضاۃ کا تقرر خود سلطان کرتا تھا اور اس عہدے پر ایسے بلند کردار اشخاص مامور ہوتے تھے جو فقہ کے جید عالم ہوتے تھے۔ جب سلطنت کے قواعد یا قوانین وضع ہوتے تھے تو قاضی القضاۃ سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں تو قاضی کے فرائض فصل خصومات سے متعلق تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے فرائض اور اختیارات میں توسیع ہوتی گئی۔ چنانچہ یتیموں اور مجنونوں کی جائداد کی نگرانی، رعایا کا انتظام اوقاف کی نگرانی وغیرہ اس کے حدود اختیارات میں داخل ہو گئے۔

سلطنت دہلی کے زمانے میں کئی قاضی القضاۃ ایسے ہوئے ہیں جو غیر ملکی شخصیت اور قابلیت کے لوگ تھے۔ سلطان علاؤ الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین میں اصول شرع کے بارے

Marfat.com

میں جو کشمکش ہوئی، وہ تاریخ سے ظاہر ہے۔ قاضی اصول شرع کی اہمیت جتنا ناچاہتا تھا۔ اور سلطان کو خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتا تھا اور اس سے سلطان اختلاف کرتا تھا

عدالت قاضی القضاۃ کے دیگر عہدہ دار یہ ہیں۔ مفتی۔ پنڈت۔ محتسب۔ داد بک جو انتظامی معاملات میں قاضی کی مدد کرتا تھا۔ (نائب سر رشتہ دار عدالت)۔ امیر داد جو عاملانہ اور انتظامی عہدہ دار تھا اور سلطان کی غیر موجودگی میں عدالت مظالم کی صدارت کرتا تھا اور گورنروں اور سپہ سالاروں کی شکایتیں سننے کا مجاز ہوتا تھا۔

(۱۷) سلطنت دہلی کے نظام عدل گستری کی چند خصوصیات:۔

دہلی کے بہت سے ادارات ایسے تھے جو بغداد کے ادارات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ سلاطین دہلی نے غزنویوں اور پھر ان کے توسط سے سندھ کی عرب حکومت نیز سامانیوں وغیرہ کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن ان کے ادارات میں خلافت بغداد کے براہ راست اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سلاطین دہلی جن ادارات سے کام لیتے تھے۔ وہ پچھلی پشتوں کے بنائے ہوئے تھے اور سلاطین کو اس میں کچھ اضافہ نہیں کرنا پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سلاطین نے پچھلے ادارات کی خوشہ چینی ضرور کی مگر ان کو جوں کا توں نہیں رکھا بلکہ ان کو ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی قالب میں ڈھال دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ دنیا کی اکثر مملکتیں نظم و نسق میں ناکام تھیں اور انتشار پھیلا ہوا تھا، ان سلاطین نے بڑی کامیابی سے ایک اچھا نظم و نسق قائم کیا۔ عدل گستری کے اس ادارے میں جو ان کو باہر سے ملا تھا، انہوں نے بہت سے اضافے بھی کئے۔ اس کی حسب ذیل خصوصیات قابل غور ہیں۔

(۱) پہلی خصوصیت محتسب کا تقرر ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے جو خلاف شرع و اخلاق زندگی گزارتے تھے، محتسب مقرر کئے گئے اور ان کے فرائض اتنے وسیع تھے کہ وہ افراد مملکت کی خانگی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔

(۲) قاضی اور تمام عہدہ داران مملکت کی خدا ترسی۔ قاضی اور مملکت کے دیگر عہدہ دار محض سرکاری ملازمت کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر اور خدا سے ڈر کر نظم و نسق کا کام کرتے تھے۔ ایسے واقعات بھی ہیں کہ قاضیوں نے بعض سلاطین کو جب وہ حد سے تجاوز کرتے، یا جادۂ حق سے گریز کرتے پائے گئے سختی سے ٹوک دیا اور حق بات بتانے سے گریز نہیں کیا۔

(۳) دیہی پنچایتوں کی سرپرستی۔ دیہی پنچایتوں کو سلاطین دہلی نے قائم رکھا اور قدیم دیہی

Marfat.com

نظم ونسق سے پورا فائدہ اٹھایا۔

(۴) محمد تغلق کے زمانے میں ایک نیا محکمہ "دیوان سیاست" بنایا گیا تھا، جو سنگین جرائم کی گرفت کرتا تھا اور سزائیں دیتا تھا۔

(۵) فیروز تغلق نے تعزیری سزاؤں میں جو حسب شرع مقرر تھیں ترمیم کی اور ایک نئے ضابطہ قانون کی بنا ڈالی۔

(۶) عدالتی کارروائیوں سے واقف ہونے اور عدالتوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے سلاطین دہلی عدالتوں سے باخبر رہتے تھے اور اخبار نویسوں کی روزانہ روائداد سے عدالتوں کی تمام خبریں مل جاتی تھیں۔

(۷) دیوانی مقدمات میں جو ہندو رعایا سے متعلق ہوتے تھے، پنڈتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ بغداد میں غیر مسلموں کے معاملات میں بھی یہی طریقہ عمل تھا۔

(۸) ایسے قاضی جو نااہل یا بدکردار ثابت ہوتے تھے، فوراً خدمت سے الگ کر دیئے گئے۔

(۹) وزیر یا وزیر اعظم کو خاص مقدموں میں اختیار سماعت حاصل تھا۔ بغداد میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔

(۱۰) سلاطین دہلی نے ہندوستان کے قدیم نظم ونسق سے بھی فائدہ اٹھایا۔

(۱۱) سلاطین دہلی نے رسم ورواج کو بھی اپنے نظام میں جگہ دی تھی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی رسوم مسلمانوں کی زندگی میں ایسے اثر انداز ہوئے کہ وہ جزو لاینفک ہو گئے۔

(۱۲) عدلیہ کو عاملہ سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

(۱۳) اسلام کا بنیادی اصول کہ کوئی مسلمان حکمران قانون سے بالاتر نہیں پوری طرح مسلم تھا۔ چنانچہ دیگر افراد مملکت کی طرح سلاطین بھی قاضی کی عدالت میں حاضر ہوتے تھے۔

(۱۸) بہمنی سلاطین :-

خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں دکن میں جو ادارات قائم ہوئے وہ سلطنت دہلی کے آفریدہ تھے۔ نظام عدل گستری بھی دہلی کا آوردہ تھا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے دور میں دکن پر خلجی سلطنت کی براہ راست عملداری قائم ہوگئی تو پھر دکن سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ اور یہاں خلجی صوبہ دار امرا اور دیگر عہدہ دار مامور ہو گئے۔ جب ۱۳۲۷ء میں ہندوستان کے دو پایہ تخت قرار دیئے گئے یعنی دہلی کے علاوہ دولت آباد بھی پایۂ تخت بنایا گیا۔ تو دہلی کے

Marfat.com

تمام ادارات ایک ایک کر کے کر کے دکن منتقل ہو گئے۔ چنانچہ دکن میں دلی کا صوبجاتی نظام بھی قایم ہو گیا۔ جب دکن میں بہمنی سلطنت کی داغ بیل پڑی تو جو ادارات دکن کو خلجیوں اور تغلقوں سے ورثے میں ملے تھے، وہی بہمنی نظم ونسق کے اجزائے ترکیبی بن گئے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو نظام عدل گستری عرب سے نکل کر دلی آیا اور پھر دلی سے بلاواسطہ یا بالواسطہ دکن پہنچا اور بہمنی سلطنت کے نظم ونسق کا جزو بنا اُس کے خدوخال کیا تھا۔ اس میں بہمنیوں نے کیا تبدیلیاں اور اضافے کئے۔

بہمنی سلاطین جو، ۱۳۴۷ء سے دکن کی سیاسی کشتی کے ناخدا بنے، وسطی دکن کے بڑے تمدنی معمار رہیں۔ بعض بہمنی سلاطین بڑے عالم اور غیر معمولی قابلیت کے حامل تھے۔ ان کے نظم ونسق میں دوراندیشی اور سیاسی دانائی پائی جاتی ہے۔ بہمنی سیاست میں جمہوریت کی بعض جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں، جو عرب سے متوارث ہوئی تھیں۔ چنانچہ اسماعیل مخ کو جو دکن کا پہلا خود مختار حکمران تھا، تمام "امیران صدہ" اور دکن کے مسلمانوں نے منتخب کیا تھا اور اس کے دو سال بعد جب حسن جیسی لائق اور موزوں شخصیت پر نظر پڑی تو پھر آخر الذکر کو تخت پر بیٹھا دیا۔ اس انتخاب میں خود ناصرالدین شاہ (اسماعیل مخ) بھی شریک تھا۔ لیکن جب علاؤالدین حسن نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے محمد خاں کو جانشین نامزد کر دیا تو پھر شاہی موروثی ہوگئی جسے ایرانی وسندو ستانی روایات کی یادگار کہنا چاہیئے۔ تاہم اس کے جواز کے لئے بغداد اور دلی کی طرح یہ صورت نکالی گئی کہ امرا فضلاء اعیان ملک، سادات، مشایخ اور جمہور سے بیعت لی جانے لگی۔ جب علاؤالدین ثانی نے ہمایوں کو تخت کے لئے نامزد کیا تو ادباب سیاست نے ہمایوں کو ناموزوں سمجھ کر اس کی جگہ حسن خان کو تخت نشین کر دیا اور اس کی وجہ سے خانہ جنگی ہو گئی۔ اس کے بعد دوسری مثال فیروز شاہ بہمنی کی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو جانشین کرنا چاہا تو عوام نے اس کی مخالفت کی اور اس کے بھائی احمد خان کو بادشاہ بنا دیا۔ اب رہا حکومت کا چلن تو وزرا بادشاہ کو مشورے دیتے تھے۔ اور علما بادشاہ پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ حضرت زین الدینؒ نے محمد شاہ اول پر نکتہ چینی کی اور اسے شرع کا پابند بنایا۔ بہمنی سلطنت کے لئے ایک دستور بھی مرتب ہوا تھا۔ اس میں بادشا کے اختیارات، فرایض اور حقوق کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور رعایا کے حقوق و فرایض کی وضاحت بھی ہے۔ اس طرح بہمن شاہی شمال کی "رعایا پرور شخصی حکمرانی" سے آگے بڑھ گئی تھی اور اس میں "دستوری شاہی" کا رنگ جھلکتا تھا۔ بہمنی شاہی میں "بادشاہ مع وزراء" کی شان پائی جاتی تھی۔

Marfat.com

دیوان میں وزراء کی مجلسیں ہوتی تھیں، جن میں بادشاہ اور وزراء آپس میں مشورہ کرتے تھے اور اگر بادشاہ غلطی کرتا تو وزراء اس کو ٹوکتے تھے۔

عام نظم ونسق | بہمنیوں کے نظم ونسق کو دو ابواب یعنی مرکزی اور مقامی حکومت کے تحت دیکھنا چاہیئے۔ مرکزی حکومت کی اعلیٰ ترین شخصیت خود سلطان کی ذات تھی۔ یہ "دربار" اور "دیوان" میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ دربار اصل میں ایک بڑا ایوان تھا جس میں مملکت کے بڑے عہدہ دار جمع ہوتے تھے۔ اس کا اجلاس ہر روز صبح سے دوپہر تک ہوتا تھا۔ اور اس دربار میں نہ صرف فرامین شاہی جاری ہوتے تھے بلکہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی اطلاعات وصول ہوتی تھیں اور رعایا کی شکایتوں کی سماعت ہوتی تھی۔ "دیوان" میں وزراء کا اجتماع ہوتا تھا۔ وزراء کے تصفیوں کو اکثر بادشاہ تسلیم کر لیتا تھا۔ دیوان کے اجلاس بھی روزانہ ہوتے تھے اور دیوان میں صرف سیاسی اور مملکتی امور طے پاتے تھے۔ محمد شاہ اول کے عہد میں وزراء کی تعداد آٹھ مقرر تھی اور ہر وزیر کے ذمہ ایک قلمدان وزارت ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک وزیر اعظم بھی تھا جس کو وکیل السلطنت یا وکیل مطلق کہتے تھے۔ یہ تمام وزراء کا صدر اور سلطان کا نائب تھا۔ وکیل کو سلطنت دہلی کی طرح "ملک نائب" کہا جاتا تھا۔ ملک سیف الدین غوری اور خواجہ محمود گاواں جیسی عالی مرتبت شخصیتیں اس عہدے پر فائز رہی ہیں۔

صلاطین اپنے وزراء اور دیگر عہدہ داروں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وزرا اور دوسرے بڑے افسروں کی گرفت بھی ہوتی تھی اور جہاں ان سے غلطی سرزد ہوتی، سزا بھی دی جاتی تھی۔ مثلاً دلاور خاں افغان کو جو وزیر خارجہ تھا، علاؤالدین ثانی نے رشوت کے الزام میں معزول کر دیا اور اس سے اعزازات واپس لے لئے۔

مرکز کی طرح صوبوں کی حکومت بھی باقاعدہ تھی۔ مملکت کو مختلف انتظامی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حلقہ میں متعلقہ افسر مامور تھے۔ ان انتظامی حلقوں کی سب سے بڑی اکائی "طرف" تھی جس کو مغل شہنشاہ "صوبہ" کہتے تھے۔ طرف سے مزید تقسیم "سرکاروں" میں کی گئی تھی اور ہر سرکار میں متعدد "پرگنے" تھے۔ ہر پرگنے میں کئی موضع تھے اور اس طرح "موضع" نظم ونسق کی ابتدائی اکائی تھا۔

بہمنی سلطنت میں ہندو بھی نظم ونسق میں شریک تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ یہاں تک رواداری کی گئی کہ ان کے مندر بنوا دیئے گئے اور معاشیں مقرر کی گئیں۔

عدل اور شرع اسلام:۔ بانی سلطنت حسن پہلا بادشاہ ہے، جس نے دکن میں تمام شعائر اسلام جاری کئے تا اینکہ جنگ و جدل میں بھی اس نے اسلامی اصولوں کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مثال کے طور پر مال غنیمت اس نے فوجوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ دادخواہوں کی فریاد سنتا تھا۔ فیروز شاہ مصحف پاک کی کتابت سے اور اس کی بیوی لباس پر نقش کر کے اپنی روزی مہیا کرتے تھے۔

احمد شاہ کو "امام عادل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ ولی کے نام سے مشہور ہے۔ جب نرسنگ رائے کی مدد کے لئے الغ خاں آیا تو احمد شاہ نے اس سے لڑنے کے لئے علماء سے فتویٰ حاصل کیا اور جنگ کے بعد سپاہیوں میں مال غنیمت تقسیم کیا۔ سلطان علاؤ الدین ثانی کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں جامع مسجد میں خطبہ بھی پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ خطبہ میں اس نے اپنے لئے کچھ القاب استعمال کئے تو ایک عرب تاجر نے اعتراض کر دیا اور کہا کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ سلطان نے عرب کے نقصان کی تلافی کرا دی اور پھر مرنے تک باہر نہیں آیا۔

کم و بیش ہر سلطان نے اپنے جانشین کو عدل و انصاف کی تلقین کی۔ سلاطین بہمنی عفو و درگزر سے بہت کام لیتے تھے۔ تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک سرکش امیر معین الدین نے لڑائی کے بعد معافی چاہی تو علاؤ الدین حسن نے اسے معاف کر دیا۔ اسی طرح نرائن کو بھی معافی چاہنے پر معاف کر دیا۔ محمد شاہ دبیلم پٹن کی مہم سے واپس آ رہا تھا تو عین راستے میں راجہ کان تلنگ نے حملہ کر دیا اور شکست کھائی۔ ان کے معافی چاہنے پر سلطان نے معاف کر دیا۔ مجاہد شاہ نے اپنے تمام حملوں اور لڑائیوں میں محمد شاہ کی وصیت کے بموجب کبھی قتل عام نہیں کیا۔ محمد شاہ دوم کہتا تھا کہ بادشاہوں کو ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ خزانہ اہل ملک کی امانت ہے۔ ہمسایہ راجہ دیو رائے نے ایک سنار کی لڑکی کو زبردستی حاصل کرنے کی غرض سے مدگل پر حملہ کیا تھا اور بعد میں سنار اپنی بیٹی کو لے کر وہاں سے فرار ہو گیا تو محض اپنی رعایا کی خاطر فیروز شاہ نے دیو رائے پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دی پھر اس کے معافی چاہنے پر اس کو معاف کر دیا۔

عدل کے معاملہ میں سلاطین بہمنی سختی سے کام لیتے تھے۔ ایک سید کی بے عزتی کرنے کے الزام میں احمد شاہ نے شیر ملک جیسے عہدہ دار کو موت کی سزا دے دی۔ علاؤ الدین ثانی نے حضرت بندہ نواز رحؒ کے پوتے کو بھی نہیں چھوڑا شراب نوشی و عیاشی کی علت میں اس کو پوری سزا دی۔ شہزادہ مجاہد نے خزانہ شاہی سے کچھ روپیہ چرا لیا تو محمد شاہ اوّل نے اسے سزا دی۔ ہندوؤں کے ساتھ رواداری برتی جاتی تھی۔ اور ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

Marfat.com

قانون | دیگر مسلمان حکمرانوں کی طرح بہمنی سلاطین بھی قانون سازی کے اختیارات نہیں رکھتے تھے اور ان کا فرض صرف اتنا تھا کہ ملک میں شرع اسلام کی پابندی کروائیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو سلاطین دہلی کی طرح بہمنیوں نے بھی اپنے فرامین کے ذریعہ بعض نئے اصول اور قوانین وضع کئے تھے۔ گو مذہبی قانون مستثنیٰ تھا لیکن عام قانون میں ترمیم ہوئی۔ تعزیرات اور سزاؤں میں دہلی کی طرح یہاں بھی بہتری تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

محکمہ عدلیہ | بہمنیوں کا عدالتی انتظام بالکل شرع شریف کے مطابق تھا۔ قاضیوں کو عدالت کا کامل اقتدار حاصل تھا۔ عدالتیں شرعی قانون پر عمل کرتی تھیں اور سلطان کے علاوہ صدر، قاضی، مفتی محتسب وغیرہ بھی شرعی احکام کے اجرا میں کسی قسم کی تاخیر جائز نہیں سمجھتے تھے۔

بہمنی سلاطین عدالتوں کا معائنہ بھی کرتے تھے۔ فریقین مقدمہ کے بیان سنتے اور حاکم عدالت کے فیصلوں کو خود بھی جانچتے تھے۔ اس کے علاوہ حسب ضرورت قاضیوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے تاکہ فیصلے حقیقی انصاف پر مبنی ہوں۔

بانی سلطنت علاؤ الدین حسن نے محکمہ قضا پر خاص توجہ مبذول کی تھی اور عدلیہ کے انتظام کا جو خاکہ مرتب کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی قائم رہا۔ البتہ فیروز شاہ نے "دفتر شاہی" کے نام سے ایک اور عدالت قائم کی تھی۔ یہ گویا پریوی کونسل کے مماثل ادارہ تھا۔ اور وکیل مطلق کو تفویض تھا۔ مملکت کی عدالتوں کے اہم فیصلے دفتر شاہی میں آتے تھے۔ وکیل مطلق ان کی جانچ پڑتال کر کے بادشاہ کے ملاحظہ میں گزرانتا اور جو فیصلے صحیح ہوتے وہ واپس کر دیئے جاتے۔ دیوانی فوجداری کی علیحدہ علیحدہ عدالتیں تھیں اور محتسب اور قاضی عسکر کے بھی علیحدہ دفتر تھے۔

سزائیں | علاؤ الدین ثانی نے صرف حبس دوام کی سزا دی تھی جو اس کی سخت سے سخت سزا تھی۔ لیکن قصاص کی سزاؤں میں جو قاضیوں کے حکم سے دی جاتی تھیں، سلاطین مداخلت نہیں کرتے تھے۔ اس دور میں سب سے زیادہ سزائیں باغیوں کو دی گئیں۔ سزا دینے سے پہلے مفتیوں اور فقیہوں کا فتویٰ ضرور حاصل کیا جاتا تھا۔ قتل اور کبھی جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ اکثر صورتوں میں معاف بھی کر دیا گیا۔

باغیوں کی تعزیر کے بعد دوسری بڑی سزائیں چوروں اور ڈاکوؤں کو دی گئیں۔ مثال کے طور پر محمد شاہ اوّل نے ۶-۷ ماہ میں بیس ہزار رہزنوں کو قتل کیا تھا۔ ظالموں کو جو رعایا پر ظلم کرتے تھے، نیز قمار بازوں اور شرابیوں کو بھی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ بلکہ گلا دبا بھی ...

جرم تھا اور صرافوں کو اس جرم کی پاداش میں قتل کی سزا دی گئی نہ صرف قاتل کو قتل کی علت میں بلکہ شریک جرم کو موت کی سزا دی گئی۔ توہین بھی سنگین جرائم میں شامل تھا۔ اور بعض دفعہ اس علت میں سزائے موت دی گئی۔ سزا سے شہزادے یا سربرآوردہ اشخاص بھی بالا نہ تھے۔

ایک عورت کا دلچسپ مقدمہ تاریخ میں درج ہے۔ اس پر چار مردوں سے زنا کا الزام تھا۔ زانیہ نے قاضی کے سامنے بیان کیا چوں کہ مرد کے لئے چار عورتیں جائز ہیں۔ اس لئے مجھے یہ غلط فہمی ہوئی کہ عورت کے لئے بھی چار مرد جائز ہو سکتے ہیں۔ اسی غلط فہمی اور شبہ میں میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اب گناہ سے آگاہ ہوئی ہوں۔ آئندہ اجتناب کروں گی۔ قاضی صاحب عورت کے جواب سے متفکر تھے کہ کیا فیصلہ کریں۔ اس وقت سلطان محمد شاہ دوم دارالقضاء میں معائنہ کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ قاضی سے کہا کہ شرع میں شبہ سے حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس عورت کو چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ عورت شبہ کی بناء پر حدِ شرعی سے نجات پا گئی۔

(۱۹) بہمنی نظام عدل گستری کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں :-

۱۔ مظالم کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ فوجداری عدالت اور محکمہ فوجداری کی اصطلاحیں رائج تھیں۔

۲۔ موجودہ زمانے کی پریوی کونسل کی طرح وسطی دکن میں "دفتر شاہی" قایم تھا۔

۳۔ "صدر" مملکت کے آٹھ وزراء کی صف میں جگہ پاتا تھا۔ ان آٹھ وزراء سے بہمنیوں کی کابینہ تشکیل پاتی تھی۔ صدر نہ صرف سلطنت کی عدلیہ اور محکمہ امور مذہبی کی صدارت کرتا تھا۔ بلکہ قاضی القضاۃ بھی تھا

۴۔ دکن میں محتسب، صدر جہاں اور قاضیوں کا ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے وہ دہلی میں امیر داد کا ماتحت متصور ہوتا تھا۔

۵۔ امیر داد یا داد بک کی اصطلاحیں بہمنیوں کے ہاں نہیں پائی جاتیں۔ یہاں فوج دار کا نیا نام ملتا ہے۔

۶۔ قاضی، مفتی، محتسب، وغیرہ کو دکن میں تنخواہوں کے عوض جاگیریں دی جاتی تھیں۔

۷۔ وکیل مطلق یا وزیر اعظم عدلیہ سے بھی وابستہ تھا۔ یعنی وہ دفتر شاہی کی صدارت کرتا تھا اور سلطان کا نائب تھا۔

۸۔ بعض دفعہ دہلی میں صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کے عہدوں پر علیحدہ علیحدہ اشخاص مامور تھے دکن میں ہمیشہ ایک ہی عہدہ دار دونوں فرائض انجام دیتا تھا۔

۹۔ قاضیوں سے سیاسی کام بھی لئے جاتے تھے۔ بعض وقت قاضیوں نے فوجوں کی رہنمائی کی اور ملکی انتظام میں بھی حصہ لیا۔ اسی طرح محتسب کو حاجب بھی بنایا گیا۔

۱۰۔ دکن میں امیر حاجب کی اصطلاح نہیں پائی جاتی۔ اس کی جگہ بار بک کا عہدہ ملتا ہے۔

۱۱۔ ہندوؤں سے جزیہ نہیں لیا گیا۔ بانی سلطنت نے ستی کی رسم موقوف کی۔

۱۲۔ حدود شرعی کا نفاذ ہوتا رہا لیکن عفو و درگزر سے زیادہ کام لیا گیا اور سزا دہی میں نرمی اختیار کی گئی۔

۱۳۔ سزا کے معاملے میں چھوٹے بڑے سب مساوی سمجھے گئے۔

(۲۰) احمد نگر کے سلاطین :۔

بہمنی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اس کے کھنڈروں پر دکن کی جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئی تھیں، ان میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی بڑی سلطنتیں ہیں اور ان کی بڑی تاریخ ہے۔ یہ سلطنتیں کم و بیش دو سال قائم رہیں اور اگرچہ یہ بہمنی نظم و نسق کی پیرو تھیں لیکن بہمنی ڈھانچے میں ان کی خاص اختراعیں بھی ہوئی ہیں۔

۱۴۹۰ء سے احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت شروع ہوئی۔ یہ صرف دکنی شاہی تھی جس کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ اول نے نظم و نسق اور عدالتی انتظام میں بڑا حصہ لیا تھا۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام شاہی دور میں سلاطین سے زیادہ وزراء نظم و نسق میں ذمہ دارانہ کام کرتے تھے۔

بانی سلطنت احمد نظام الملک تو سنی تھا۔ لیکن اس کے جانشینوں نے اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا۔ سلطنت کے بڑے عہدہ دار، قاضی وغیرہ زیادہ تر شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ تاریخ سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ شیعہ قاضی سنیوں کے مقدموں میں کس فقہ سے فیصلہ صادر کرتے تھے سنی یا شیعہ۔ تعزیری مقدموں میں تو اختلاف فقہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیوں کہ تعزیرات میں بالکل یکسانیت ہے۔

نظام شاہی سلاطین نے بہمنی انداز میں وزراء مقرر کئے۔ نظم و نسق کے لئے ایک بڑا محکمہ قائم تھا، جیسے دیوان ارباب الرسوم والقضاۃ کہتے تھے۔ یہ محکمہ زراعتی، مالی، عدالتی اور دیگر انتظامی شعبوں پر حاوی تھا۔

امرا اور رعایا کے اصرار پر بعض دفعہ وزراء کو معزول کیا گیا۔ رعایا کے ساتھ کسی وزیر یا عہدہ دار کا سلوک اچھا یا منصفانہ نہ ہوتا تو اس کو بھی موقوف کر دیا گیا۔ خیانت اور بد اخلاقی

Marfat.com

کی علت میں اکثر عہدہ دار اور وزیر برطرف ہوئے ہیں۔

عدل پرستی | نظام شاہیوں کی عدل پرستی کئی واقعات سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دلپت رائے اور مسند عالی میں جھگڑا ہو گیا تو بانی سلطنت احمد نے ان دونوں کو نصیحت کر کے کہا کہ چونکہ شاہی ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کے لئے حکما نے پانچ نصیحتیں کی ہیں۔ اوّل یہ کہ شعلہ خشم کو آب حلم سے بجھائیں۔ دوسرے یہ کہ وسوسہ شیطان سے پرہیز کریں۔ تیسرے یہ کہ حرص و حسد اور طمع کو اپنی عقل پر حاوی نہ ہونے دیں۔ چوتھے یہ کہ ہر کام راستی اور دور اندیشی کے ساتھ کیا کریں۔ پانچویں یہ کہ جو واقعات اور حادثات پیش آئیں، نرمی اور اخلاق کے ساتھ ان کی تلخی دور کریں۔

مرتضیٰ نظام شاہ اوّل نے سلطنت کے کاروبار سید قاضی وکیل السلطنت کو تفویض کر دیئے کیوں کہ وہ اپنے میں حکمرانی کی صلاحیت نہیں پاتا تھا۔ تفویض اختیارات کے وقت اس نے کہا کہ میں امور سلطنت میں غور و فکر کے ساتھ کام کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں اور اس لئے عدل کی بجائے ظلم اور ظلم کی بجائے عدل واقع ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوش کا بار سید قاضی پر ڈال دوں اور خود چند روز آرام سے گذاروں۔ مرتضیٰ نے ایک زنجیر عدل بھی لگائی تھی۔ ان واقعات سے اس کی خدا ترسی اور دیانت داری معلوم ہوتا ہے۔

محکمہ عدلیہ | بہمنیوں کی طرح نظام شاہیوں نے بھی عدلیہ کو عاملہ سے الگ رکھا تھا۔ قاضی نہ صرف عدلیہ کے عہدہ دار تھے بلکہ بیرونی دشمنوں سے صلح کی گفت و شنید کے لئے بھی روانہ کئے جاتے تھے۔

جرائم میں سب سے بڑا جرم بغاوت سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا قتل تھی۔ حاجب اور کوتوال بھی مقرر تھے۔

خصوصیات | (۱)۔ نظام شاہی سلطنت میں دہلی یا سلطنت بہمنی کی طرح محتسب مقرر نہ تھے بلکہ قاضی ہی محتسب کے فرائض انجام دیتے تھے۔

۲۔ دیوان مظالم قایم تھا۔

۳۔ بہمنیوں کے وکیل مطلق کا مددگار پیشوا ہوتا تھا۔ احمد نگر میں وکیل اور پیشوا کا ایک ہی عہدہ ہو گیا۔

۴۔ نظام شاہی عدلیہ ایسا منظم اور ترقی یافتہ نہ تھا جیسے بہمنی نظام میں دکھائی دیتا ہے۔

Marfat.com

(۲۱) بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

۱۴۸۹ء میں یوسف عادل شاہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس کے بعد یہ موروثی شاہی ہوگئی۔ بانی سلطنت یوسف علی عادل شاہ اول بڑے عالم اور فاضل تھے اور علی عادل کے زمانے میں علماء اکثر مباحثہ و مذاکرہ میں مصروف رہتے تھے۔ فقہ اور حدیث کا علم بیجاپور میں عام چرچا تھا۔ عادل شاہی سلاطین امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور اپنے کو شاہ ایران سے منسلک سمجھتے تھے۔

عام نظم و نسق اگرچہ عادل شاہیوں نے بہمنی نظم و نسق کی پوری نقل کی تھی تاہم ان کے بعض دلچسپ خدوخال بھی غور طلب ہیں۔

صبح سے شام تک بادشاہ کا پورا وقت ایک وقتنامہ کے مطابق صرف ہوتا تھا۔ صبح کو عالموں اور فاضلوں کی مجلس گرم رہتی لیکن اسی کے دوران بادشاہ مملکت کی خبریں بھی سنتا تھا جو جاسوسوں کے ذریعہ وصول ہوتی تھیں۔ خبروں سے واقف ہونے کے بعد دربار میں اجلاس کرتا تھا۔ اور دربار بہمنیوں کی طرح ظہر کی نماز تک تین گھنٹے جاری رہتا تھا۔ سوائے جمعہ کے ہر روز دربار ہوتا تھا۔ دربار میں ہر فرد مملکت کو [illegible] شکایت پیش کرنے کی اجازت تھی۔ مملکت کے اہم مسائل پر بحث کے [illegible] امیروں کی علیحدہ مجلس ہوتی تھی۔ دربار برخاست ہونے کے بعد دو گھنٹے تک بادشاہ آرام کرتا اور اس کے بعد [illegible] کے ساتھ مملکت کے مختلف مسائل پر گفتگو اور بحث کرتا تھا۔ اس طرح صبح سے شام تک [illegible] وقت نامہ تھا جس کی عادل شاہ پابندی کرتا تھا۔

بہمنیوں کی طرح عادل شاہی نظام حکومت میں بادشاہ ہی کا عہدہ [illegible] امور مملکت میں بادشاہ وزراء کا مشورہ حاصل کرتا تھا۔ سچ پوچھو تو تمام اہم مسائل میں وزراء کے علاوہ امراء علماء اور فضلاء سے بھی مشورہ کیا جاتا تھا۔ بعض مرتبہ سپاہ سے بھی مشورہ کیا گیا۔

مرکزی حکومت میں سلطان کے بعد سب سے بڑا عہدہ دار وزیر اعظم یا وکیل السلطنت تھا، جو سلطان کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ مالیہ کا وزیر امیر جملہ تھا جس کی مدد کے لئے ایک اور عہدہ دار مستوفی ملک بھی مامور ہوتا تھا۔

عادل شاہی سلاطین اپنے وکیل اور دوسرے وزراء کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور وزراء کی خوشنودی پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اسد خاں لاری اور بادشاہ کا تعاون تاریخ کا زریں ورق ہے۔ دونوں اس طرح مملکت کے کام انجام دیتے تھے کہ گویا خاندان کے دو رکن اپنے

Marfat.com

گھر کو سنبھال رہے ہیں۔ اسی طرح جب افضل خان کو سلطان نے ہندو امرا کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا تو افضل خاں نے درخواست کی کہ" دست مبارک خود بر سر من نہند مرا دریں کار تقویت دیگر حاصل می شود"۔ اس پر سلطان نے اس کو سینے سے لگایا اور بوسہ دیا۔ اس طرح عہدہ دار پورے خلوص دل کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیتے تھے۔

صوبائی نظم ونسق بھی مرکزی حکومت کی طرح بہمنی انداز میں مرتب تھا۔ دیوانی علاقہ کے علاوہ بیجاپور میں جاگیریں بھی تھیں اور باجگزار علاقے بھی تھے۔ ان علاقوں کے اندرونی انتظام میں مرکزی حکومت زیادہ دخل تو نہ دیتی تھی البتہ ان کا عدالتی نظم ونسق مرکز کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ خود سلطان قاضی کا تقرر کرتا تھا اور بعض وقت خود جاگیر دار کو قضاء کا کام تفویض کر دیا جاتا تھا۔

عادل شاہی نظم ونسق کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کو حکومت میں کافی جگہ دی گئی تھی اور فوجوں کی فوجیں زیادہ تر مرہٹوں پر مشتمل تھیں۔ ان کو جاگیریں بھی دی گئیں۔ اور خود بیجاپور کی شاہی فوج میں بہت سے ہندو نوکر تھے۔

عدل اور شرع اسلام | دوسرے اسلامی حکمرانوں کی طرح عادل شاہی سلاطین بھی عدل و انصاف کو بادشاہ کا اولین فرض سمجھتے تھے۔ خود سلاطین عدالتی فرائض انجام دیتے تھے۔ یا اس کے لئے اپنا نائب مقرر کر دیتے تھے۔ قاضیوں اور مفتیوں کو سخت تاکید تھی کہ وہ شرع کے مطابق فیصلے کریں۔ بیجاپور کے مؤرخ بانیِ سلطنت یوسف عادل شاہ اور پھر اس کے بعد اسماعیل عادل شاہ، علی عادل شاہ اوّل، ابراہیم ثانی، محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کے مداح ہیں اور ان کے عدل و انصاف کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اسماعیل کے عفو وکرم کا یہ حال تھا کہ وہ سیاسی ملزموں کو بھی معاف کر دیتا تھا۔ علی عادل اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ تم جب کبھی مجھ میں قابل اعتراض چیز دیکھ پاؤ ٹوک دیا کرو۔ یہ کبھی کبھی اپنے ملازمین کے دسترخوان پر بھی بیٹھ جاتا تھا۔ علی عادل کی نیک اور سادا طبیعت کا یہ رنگ تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا۔ اس کے مطبخ کے لئے عوام کی طرح بازار سے گوشت خریدا جائے اور مٹی کے برتن استعمال کئے جائیں۔ بیجاپور کا یہ شاہی خاندان صرف نام کا "عادل" نہیں تھا بلکہ واقعی عدل پروری اور دادگستری کے اوصاف سے بخت متصف تھا۔

گو بانیِ سلطنت نے شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوا کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر کاربند رہ سکتا ہے۔ اس کے بعض جانشین حنفی مذہب کے

اور بعض شیعہ مذہب کے پیرو ہوتے ہیں۔ لیکن اس تبدیل مذاہب کا عدل گستری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

(۲۲) محکمہ عدلیہ

بیجاپور کا نظم و نسق بہمنیوں کا خوشہ چین ہے۔ عادل شاہی انتظام عدالت شرع شریف پر مبنی تھا۔ سلاطین عدلیہ کے عہدہ داروں کو شرع کے مطابق فیصلہ کرنے کی سخت تاکید کرتے تھے۔

مرکز کی عدالتیں | بادشاہ سب سے اعلیٰ حاکم عدالت تھا اور اس کو مرافعوں کی سماعت کا آخری اختیار حاصل تھا۔ شاہی محلات میں عدالت محل کے نام سے ایک بلند محل بنایا گیا تھا اور ایک عدالت اندرون قلعہ بیں بھی قائم تھی۔ بعد میں سلطان محمد نے قلعہ کے باہر ایک دادمحل بنا دیا اور اس میں عدالت قائم کردی۔ جاسوس سلطان کو مملکت کی دیگر خبروں کے علاوہ عدلیہ کے کاموں سے بھی باخبر رکھتے تھے۔ سلاطین عدالتی فرائض کی انجام دہی کے وقت علماء اور فاضلوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

پایۂ تخت کے عہدہ داران عدلیہ میں صدر، قاضی القضاۃ، قاضی، مفتی، محتسب اور حاجب وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ بیجاپور کا محکمہ عدلیہ بہمنی عدلیہ کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ صرف مقامی خصوصیات کا ذکر کافی ہوگا۔

تاریخ میں بعض مشہور علماء اور صدر جہاں کا تذکرہ موجود ہے۔ یوسف اور اسماعیل دو بن کے عہد میں مولانا سید احمد ہروی مسند صدارت پر فائز تھے۔ جن کے علم و فضل کی فرشتہ نے بڑی ستائش کی ہے۔ علی عادل اول کے عہد میں مولانا میر شمس الدین محمد اصفہانی جیسی بلند پایہ شخصیت صدر جہاں کے عہدے پر فائز تھی۔ محمد عادل شاہ کے عہد میں قاضی القضاۃ قاضی شرف سید سیف اللہ تھے۔

علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں قاضی نور اللہ بہت مشہور قاضی گزرے ہیں۔ ابراہیم زبیری، عبدالجلیل، عبداللہ، عزیز الدین، عبدالنبی، غلام حسین وغیرہ بہت نمایاں شخصیتیں تھیں۔ ان میں سے بعض اپنے عدالتی فرائض اس دیانت داری سے انجام دیتے تھے کہ خلفاء راشدین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قاضی ابراہیم زبیری سے ان کی بیوی نے کسی بڑھیا کی سفارش کی تو انہوں نے اسی روز عہدۂ قضا سے استعفاء دے دیا اور کہا کہ شاید اب مجھ سے انصاف نہ ہو سکے گا۔

صوبائی انتظام | صوبوں، سرکار، پرگنوں وغیرہ میں سلطان کی طرف سے قاضی قاضی مقرر ہوتے تھے۔ نیز جاگیروں میں بھی سلطان ہی قاضی کا تقرر کرتا تھا۔ صوبائی قاضیوں کو عدلیہ کے کام

Marfat.com

کے علاوہ اوقاف اور امور مذہبی کے فرایض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ عامل سرکار کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا اور یہ عاملانہ فرایض کے علاوہ "سرکار" کے قیام امن کا بھی ذمہ دار تھا اور دیوانی مقدموں کی بھی سماعت کرتا تھا۔ ہر سرکار اور پرگنے میں کوتوال بھی مقرر تھے۔

پرگنے کے قاضی کی تنخواہ مقرر تھی۔ بعض کو زمینیں بھی دی گئی تھیں اور ان کے لئے انعامات بھی مقرر تھے۔ عادل شاہیوں نے صوبجاتی نظم و نسق پر خاص توجہ کی تھی۔ وہ مملکت کے گوشہ گوشہ میں قیام امن اور اسلامی احکام کے نفاذ کی کوشش کرتے تھے۔ دیہات اور موضعوں کے انتظام پر بھی ان کی خاص توجہ تھی جہاں کہ دیہی پنچایتوں سے کام لیا گیا تھا۔ پنچایت کے فیصلوں کا مرافعہ مقامی عہدہ دار کے پاس اور آخری مرافعہ سلطان کے پاس ہوتا تھا۔

دستور حکومت | زبیری نے عادل شاہی دستور العمل اور قواعد و ضوابط کا ایک مختصر مگر دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے حسب ذیل اقتباسات قابل غور ہیں:۔

محض سنی سنائی باتوں پر بلا ثبوت مواخذہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ثبوت مل جائے تو ضرور سزا دینی چاہیئے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ فریقین مقدمہ کی پوری تحقیقات ضروری ہے اور جو اس میں جھوٹا ہو اس کو سزا دینی چاہیئے تاکہ جھوٹے مقدموں کا سدِ باب ہو جائے۔ صحیح انصاف رسانی اور مظلوموں کی دادرسی ہونی چاہیئے۔ اور رعایا کے ساتھ بہترین سلوک ہونا چاہیئے۔ احکام شرعیہ کے مطابق عمل ہونا چاہیئے۔ رشوت ستانی کی روک تھام کی جائے۔ دیانت داروں کی قدر کی جائے۔ مال غنیمت اور زکوٰۃ اور خمس وغیرہ سب جامع مسجد اور آثار محل میں جمع رہیں اور حسب احکام شرع ان کے صرف کا انتظام کیا جائے اور یہ انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوگا۔ دار الضرب میں جو طلائی اور نقرئی سکے ڈھلتے ہیں، ان میں کھوٹ ملانے کو بڑا جرم سمجھا جائے۔ عوام کو منہیات اور منکرات سے باز رکھا جائے اور سنت رسول کی تلقین کی جائے۔ چوری کی سزا حسب شرع شریف دی جائے۔ ایک فرد مملکت کو دوسرے پر ظلم کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

سزائیں | بغاوت کی سب سے زیادہ سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی سزا بھی کافی سخت دی جاتی تھی۔ جو امراء اور عہدہ دار بغاوت کرتے، ان کو منصب سے معزول کر کے قید کر دیا جاتا تھا۔ عین الملک کو بغاوت کے الزام میں قتل کیا گیا۔ جو زمیندار بغاوت کرتے، ان کی زمین چھین لی جاتی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنے بھائی اسماعیل کو بغاوت کی سزا میں ملک سے باہر کر دیا تھا۔ چوری، حرام خوری یا افعال شنیعہ کے ارتکاب پر شرع کے موافق سزا دی جاتی تھی۔

Marfat.com

سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک روز ایک مہاجن چند ساتھیوں کے ہمراہ دروازہ اللہ پور سے شہر کے باہر گیا۔ دروازہ کے باہر مہتر نائیکاں بیٹھا ہوا تھا۔ مہاجن نے اسے سلام کیا تو مہتر نائیکاں نے اس کے جواب میں بڑی بے اعتنائی کی اور بیٹھ کر ہی سلام کا جواب دیا۔ اس پر مہاجن کو بُرا معلوم ہوا اور اس نے اس میں بڑی بے عزتی سمجھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت شہر کے باہر ہی ٹھہر گیا۔ سلطان کو خبر ملی تو نائیکوں کے سردار کو معزول کر دیا اور اپنے مصاحبوں کو باہر بھیجا کہ اپنی آزردہ خاطر رعایا کو منا کر لے آئیں۔ لیکن مہاجن نے جواب دیا کہ یہاں سلطان کی رعایا کی بے عزتی ہوتی ہے۔ ہم آزاد پیشہ تاجر ہیں۔ اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتے اور ہم جس دروازے سے بے آبرو ہو کر باہر نکلے ہیں، اب اسی دروازے سے نہیں جائیں گے۔ اس پر سلطان نے حکم دیا کہ فصیل توڑ کر راتوں رات ان کے لئے ایک نیا دروازہ بنا دیا جائے۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نئے دروازے سے اپنی عزت کی ضمانت حاصل کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔

(۳۳) عادل شاہی نظام عدل گستری کی خصوصیات:-

۱۔ بیجاپور میں صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کے جداگانہ عہدہ دار تھے۔ بعض مرتبہ دونوں عہدوں پر ایک ہی شخص مامور ہوتا تھا۔ گویا اس طرح یہاں بہمنیوں کی بجائے سلطنت دہلی کی پیروی کی گئی تھی۔

۲۔ یہاں وقت واحد میں بعض دفعہ دو صدر بھی کارگزار تھے۔

۳۔ سلطنت دہلی یا بہمنیوں کی نسبت بیجاپور میں صوبائی انتظام اور خاص طور پر دیہی نظم و نسق پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔

۴۔ ذی اثر اشخاص پر عدلیہ کو زیادہ قابو نہ تھا۔

۵۔ رعایا کی انفرادی آزادی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور کوئی عہدہ دار کسی فرد مملکت کی کسی طرح بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔

۶۔ جاسوسی کا ایک منظم محکمہ قائم تھا۔

۷۔ حاجبوں سے زیادہ تر سفارتی کام لیا گیا۔

(۴۴) گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت

اس کی معاشرت و سیاست نیز اس کا نظام حکومت سب بہمنیوں کا ورثہ تھا۔ گو قطب شاہی

Marfat.com

حکومت ایک موروثی شاہی تھی تاہم نااہل یا غیر موزوں بادشاہ کی تخت نشینی پر اہل ملک ناراضگی کا اظہار کرتے تھے اور بعض دفعہ امرا اور عمائد نے موزوں شخص کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔

گولکنڈے کی تاسیس ۱۵۱۸ء میں ہوئی تھی اور قطب شاہی سلاطین نے بیجاپور کی طرح ایران کی سلطنت سے رشتہ جوڑا۔ مملکت کا مذہب شیعہ تھا۔ بعد میں مغل شہنشاہت کی سیادت چلی اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈے کا خاتمہ ہوگیا۔

عام نظم و نسق نظم و نسق کی تمامتر تنظیم ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھی۔ عاملہ کا اعلیٰ ترین عہدہ دار تو خود سلطان تھا۔ لیکن حکومت کے عاملانہ فرایض مختلف وزراء میں منقسم تھے۔ بعض وزراء تو ویسے ہی تھے۔ جیسے بہمنیوں کے عہد میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وزیر اعظم کو وکیل مطلق یا پیشوا کہتے تھے جو بادشاہ کا نائب تھا۔ بادشاہ اپنے وزراء سے مشورہ کرتے اور اس پر عمل کرتے۔ خاص معاملات میں علماء سے بھی مشورہ کیا جاتا تھا۔ دوسرا بڑا عہدہ میر جملہ کا تھا۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جملہ عدالتی فرایض بھی انجام دیتا تھا۔ عدلیہ کے عہدہ دار قاضی اور مفتی تھے۔ ایک منظم جاسوسی کا محکمہ بھی تھا۔ جب کبھی کسی عہدہ دار سے غلطی اور بداخلاقی سرزد ہوتی تو اس کو سزا دی جاتی تھی۔

مقامی حکومتوں کا دیسی ڈھانچہ تھا، جو مرکزی حکومت میں ہوتا تھا۔ سلطنت مختلف صوبوں پر منقسم تھی جن کو بہمنی تقلید میں طرف کہتے تھے۔ آخری زمانے میں سلطنت کے چھ صوبے ہوگئے تھے اور ان پر صوبہ دار مقرر تھے۔ جو طرف دار کہلاتے تھے۔ قاضی اور پنڈت مامور ہوتے تھے۔ جو عدل گستری کرتے تھے۔ صوبے کئی سرکاروں میں منقسم تھے۔ اور سرکار میں کئی سمت یا پرگنے ہوتے تھے۔ ہر سمت میں کئی محال یا موضع تھے۔ ان چھوٹی اکائیوں کا بھی وہی نظم و نسق تھا جو صوبوں کا تھا۔ سب عہدہ داروں کی تنخواہیں خزانہ شاہی سے ادا ہوتی تھیں۔

عدل اور شرع اسلام سلاطین خود عدالتی فرائض انجام دیتے تھے اور عدلیہ کے فرایض کے لئے کئی عہدہ دار مقرر تھے۔

ابراہیم قطب شاہ معمولی جرائم پر سخت سزائیں دیتا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمد قلی اور سلطان محمد قطب شاہ بڑے انصاف پسند بادشاہ گزرے ہیں۔ سلطان عبداللہ کے عدل و انصاف کی بیرونی سیاحوں نے بھی تعریف لکھی ہے۔ سلطان محمد قلی بہت نرم دل تھا اور اس نے اپنی تمام عمر میں کسی کو قتل نہیں کیا۔ اجناس کا محصول جو پچھلے زمانے میں لیا جاتا تھا، اس نے معاف کر دیا۔ محمد قلی نے بہمنیوں کی زنجیر عدل کی بجائے ایک داد محل بنایا تھا ——— جو دادخواہوں کے

لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوتا تو قاتل کو دار القضاۃ کے حوالہ کیا جاتا تھا تاکہ حسب شرع عمل کیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی سلاطین اور عہدہ دار فصل خصومات میں فقہ امامیہ پر عمل کرتے تھے۔ شرعی حد کی سزا بھی دیتے تھے۔

عدلیہ: قطب شاہیوں کی ایسی عادلانہ شان نہیں تھی جو بہمنی سلاطین کو حاصل تھی۔ تاریخی واقعات سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ سلاطین اپنے کو اسلامی قانون کا پابند سمجھتے یا قاضی کے فیصلوں کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان سلاطین نے عدل و انصاف میں بذات خود دلچسپی لی اور خود بطور حاکم عدالت انصاف رسانی کرتے تھے۔ پیشوا اور میر جملہ بھی عدلیہ کے فرائض انجام دیتے تھے۔

صدر جہاں کا عہدہ بھی تھا اور محمد قطب شاہ کے عہد میں قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی نظر آتا ہے۔ اس دور میں بعض قاضی ایسے بھی ہوئے ہیں، جن کی بہت شہرت تھی۔ لیکن ان کے فرائض یا طریقہ کار سے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان قانونیوں سے عدلیہ کے علاوہ دوسرے اہم کام بھی لئے گئے یعنی بطور حاجب دوسری سلطنتوں کو پیغام پہنچاتے تھے اور کبھی فوج کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔

ہندوؤں کے فصل خصومات کے لئے پنڈت مقرر تھے

سزائیں: بغاوت سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اور موت یا جلا وطنی کی سزا دی جاتی تھی چوری اور قزاقی کی بڑی سخت سزا تھی۔ ابراہیم قطب شاہ نے چوروں اور ڈاکوؤں کو کوڑے لگوائے اور پیر کے ناخن اکھاڑ دیئے

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک امیر نے کسی صراف کو محل میں بند کر کے اس سے زبردستی پانچ ہزار روپیہ وصول کر لئے۔ بادشاہ نے اس کو سزا دی اور رقم واپس کرا دی۔ ایک عہدہ دار الچی بیگ نے تاجروں سے قرض لیا تھا۔ اور ادا نہیں کر رہا تھا۔ تاجروں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی تو عبداللہ نے تیس یا چالیس ہزار ہون اس کی آمدنی سے ادا کر دیئے اور بقایا رقم شاہی خزانے سے دلوا دی۔

عام رواج یہ تھا کہ ملزم کو قید میں نہیں رکھا جاتا تھا۔ بلکہ فوراً حاکم قاضی کے پاس پیش کر دیا جاتا تھا اور وہ شہادت سننے کے بعد سزا پاتا یا بری کر دیا جاتا۔

Marfat.com

(۲۵) قطب شاہی نظام عدل گستری کی خصوصیات :-

۱۔ قطب شاہیوں نے تلنگانہ کے ماحول میں اپنی سلطنت کو ایک آندھیرا راجدھانی کی شکل دے رکھی تھی اور قانون مملکت میں رسم و رواج بھی داخل ہوگئے تھے۔

۲۔ ہندوؤں کو عام نظم و نسق کے علاوہ عدل گستری میں بھی دخیل کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں بھی جو ابتدائی زمانے میں قائم ہوئی تھیں ہندوؤں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تعاون بڑھتا گیا اور مختلف سلطنتوں میں ہندو دخیل ہوگئے۔ بالآخر قطب شاہی سلطنت میں ہندوؤں کو سب سے زیادہ سرپرستی حاصل ہوگئی۔ حتی کہ ہندو وزیر اسلامی حد کی سزا بھی دینے لگے۔

۳۔ جاسوسی کا ایک منظم محکمہ بنایا گیا۔

۴۔ انگلستان کے قانون احضار ملزم (ہیبیس کارپس) کے اصول کی طرح گولکنڈے میں یہ رواج تھا کہ ملزموں کو قید میں نہیں رکھا جاتا تھا۔ بلکہ گرفتاری کے فوراً بعد حاکم مجاز کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ گو حد کی سزائیں نافذ تھیں۔ لیکن اسلامی تعزیری سزاؤں میں کافی تبدیلی کی گئی۔ اور بعض جدتیں بھی کی گئیں۔

۶۔ مظلوموں کے لئے ایک پناہ گاہ یعنی "امان محل" بنایا گیا تھا۔

گزشتہ مباحث سے حسب ذیل اصول یا سبق ملتے ہیں :-

(۱) گو اسلامی مملکت میں ایک عالمگیر تصور موجود ہے اور یہ اسلامی اخوت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن وسطی دور کے آخری حصے میں چھوٹی چھوٹی جغرافی وحدتیں عملاً ایک مسلمہ امر بن گئیں۔ دور حاضر میں جب ایک جغرافی وحدت کو قومی مملکت تصور کیا جاتا ہے تو کسی عالمگیر اسلامی مملکت یا خلافت کا تصور باقی نہیں رہتا۔ البتہ یہ امر ممکن ہے کہ دنیا کی ساری اسلامی مملکتیں کسی نہ کسی انداز میں ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ مثال کے طور پر UNO یا تنظیم اقوام متحدہ کی طرح ایک جداگانہ تنظیم بنائی جاسکتی ہے جس میں اجتماعیت ہو اور جو اولین اسلامی مملکت کی عکاسی کرے۔ حالیہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قابل عمل ہے۔ ابھی حال میں R.C.D کے نام سے پاکستان، ایران اور ترکی نے جو تنظیم بنائی ہے، اس میں اس تصور کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کے دائرے کو وسعت دی جائے اور ساری اسلامی مملکتیں اپنی مشترک

Marfat.com

تنظیم بنالیں تو بڑی حد تک اس مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے

(۲) "حلف الفضول" ایک کارآمد ادارہ تھا۔ دورِ حاضر کی اسلامی مملکتوں میں عدل گستری کی تنظیم موجود ہے۔ اس کے باوجود حلف الفضول جیسی رضا کار جماعت کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسلامی مملکتیں اپنے تمام شہر و قصبات میں اس قسم کی جماعتوں کو فروغ دیں اور ان کو سرکاری حمایت بھی حاصل ہو تو افراد مملکت کے حقوق کی حفاظت میں ایک بہتر باب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۳) انصاف کے معاملہ میں بڑے اور چھوٹے سب مساوی ہیں۔ یہ اصول ہمیشہ برقرار رہا کہ صدر مملکت پر عدالت میں مقدمہ دائر ہو سکتا ہے اور وہ خود کسی پر مقدمہ چلا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں صدر مملکت قانون ملک کے تابع رہا۔

(۴) جو قانونی اصول ہم کو ملتے ہیں، ان کے پیش نظر نافذ الوقت قوانین میں کافی تبدیلی کی گنجائش ہے۔ خاص طور پر قانون شہادت، تعزیرات اور دیوانی و فوجداری کارروائیوں میں ضابطہ کے تعلق سے قوانین نافذہ میں اسلامی روح پھونکنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ساری اسلامی مملکتیں بالکم از کم ان کی اکثریت اشتراک عمل سے کام کرے تو بہتر نتائج کی توقع ہے۔

(۵) ابتدائی زمانہ اسلام میں یہ اصول پیش نظر تھا کہ انصاف کے معاملہ میں معاوضہ نہیں لینا چاہئے یعنی عدل گستری مفت ہونی چاہیئے۔ کوئی رسوم عدالت نہیں لئے جاتے تھے اور ہر فریادی بلا روک ٹوک عدالت آ سکتا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ حال کی مملکتیں بعض افادی مدات میں زر کثیر خرچ کرتی ہیں۔ اور اپنے بجٹ میں اس کی گنجائش رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر مفت تعلیم یا افراد مملکت کی دیگر بنیادی ضرورتوں جیسے مفت طبی امداد وغیرہ پر خاطر خواہ توجہ کی جاتی ہے۔ لیکن کسی فرد مملکت کی حق تلفی ہو یا ظلم و ستم، تو حکومت خاموش ہو جاتی ہے۔ داد رسی کے لئے خود مظلوم کو اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انصاف رسانی لازمۂ تہذیب اور فریضہ انسانی ہے اور داد رسی فرد مملکت کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس لئے مظلوم سے انصاف رسانی کے لئے معاوضہ لینا نہ صرف سماج دشمنی ہے بلکہ اسلامی اصول کے مغائر ہے۔

جب زمانہ حال کی مملکتیں دوسرے شعبہ ہائے حیات میں افراد مملکت کی فلاح و بہبود کی خاطر زر کثیر خرچ کر سکتی ہیں۔ تو اپنے میزانیے میں مفت عدل گستری کی بھی گنجائش رکھ سکتی ہیں۔

(۶) اسلام نے عدلیہ کو عاملہ سے آزاد رکھا تھا۔ زمانہ حال کی اسلامی مملکتوں کے سامنے یہ ایک بہت اچھی مثال ہے۔ اس کی پوری طرح پابندی ہو سکتی ہے۔

(۷) خلافت راشدہ میں صوبوں اور ضلعوں کے حکام عموماً مقامی باشندوں کے انتخاب پر مقرر ہوتے تھے۔ نیز کسی حاکم سے مقامی آبادی ناراض ہوتی تو اس کو معزول کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان سلاطین نے بھی اہل ملک کی خوشنودی کو اس معاملے میں پیش نظر رکھا۔

(۸) عہدہ داروں کے تقرر کے وقت ان کے مال و اسباب کی تفصیلی فہرست تیار کی جاتی تھی۔ اگر عہدہ دار اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرتا یا اس کے مال و اسباب میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔

(۹) صدر مملکت اعلیٰ حکام کے خلاف افراد مملکت کی شکایات خود سنتا تھا۔ اور دادرسی کرتا تھا۔ نیز مظلوموں کی بھی براہ راست رسائی صدر مملکت تک ہو سکتی تھی۔

(۱۰) رشوت یا ناجائز وسائل آمدنی سے روکنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں، ان میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ قاضیوں کو کافی بڑی تنخواہیں دی گئیں۔ اس عہدے پر دولت مند اور معزز اشخاص کا تقرر کیا گیا۔ قاضی کو تجارتی کاروبار کی ممانعت کی گئی۔ خود صدر مملکت فریق مقدمہ کی حیثیت میں حاضر عدالت ہوتا تھا تاکہ عدالت کی کارکردگی دیکھی جائے۔ عہدہ داروں کی لغزش پر سخت داروگیر ہوتی تھی۔

(۱۱) مرافعہ کے وقت ضرورت محسوس کی جاتی تو از سر نو تحقیقات ہوتی تھی۔

(۱۲) عدالتی عہدہ داروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید تھی۔ قاضیوں کو خلاف شرع فیصلہ کرنے پر سلطنت دہلی کے دور میں موت کی بھی سزا دی گئی۔ نااہل قاضیوں کو علیحدہ کیا گیا۔

عدالتی عہدوں کی اس اہمیت کے پیش نظر یہ امر مناسب ہوگا کہ جو نئے عہدہ دار عدلیہ کے لئے نامزد ہوں، ان کی خاص تربیت کی جائے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں سی۔ایس۔پی اکادیمی عاملہ یا انتظامیہ کے آئندہ عہدہ داروں کی خاص تربیت کرتی ہے۔ اسی اکادیمی یا اس کے مماثل کسی ادارے کے توسط سے عدلیہ کے تمام آئندہ عہدہ داروں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ نہ صرف اسلامی اصول قانون اور اصول اجتہاد سے واقفیت حاصل کریں بلکہ اسلامی نظام عدل گستری اور مسلمان حکمرانوں کے سابقہ تجربوں سے بھی واقف ہو جائیں اور اسلامی عدل کی پوری اہمیت ان کے ذہن میں سما جائے۔ اس قسم کی تربیت تمام اسلامی ملکوں میں مفید ہوگی۔

Marfat.com

(۱۳) دیوان قضاء اور دیوان مظالم عدل گستری کے بڑے ادارے تھے۔ محکمہ احتساب کا بھی بڑا کام تھا۔

دورِ حاضر میں دیوانی اور فوجداری عدالتیں تو قایم ہیں۔ لیکن ان میں اسلامی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی احتساب کے محکمہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہ محکمہ جو ابتدائی زمانۂ اسلام سے چلا آتا ہے، نہ صرف سلاطین دہلی کے دور میں کارگزار رہا بلکہ بہمنی عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین کے دور میں بھی باقی رہا۔

(۱۴) حضرت عمر فاروق کے عہد میں محکمہ افتاء قایم ہوا تھا۔ اسی طرح اموی اور عباسی، نیز سلاطین دہلی اور دکن کی حکومتوں میں بھی مفتی مقرر ہوتے رہے۔ موجودہ زمانے کی اسلامی مملکتیں اس ادارے سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور ایسے اشخاص کا تقرر کر سکتی ہیں جو نہ صرف فقہ اور شرع اسلام کے ماہر ہوں بلکہ تقابلی اصول قانون اور مملکت کے قوانین سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہوں۔

(۱۵) قاضی اور مملکت کے دیگر عہدہ دار محض سرکاری ملازمت کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر اور خدا سے ڈر کر نظم و نسق میں حصہ لیتے تھے۔ عادل شاہی دور میں بادشاہ اور بڑے عہدہ دار ایسی یک دلی اور یگانگت کے ساتھ کام کرتے تھے کہ گویا ایک گھر کے ارکان ہیں اور گھر کی نگہداشت کر رہے ہیں۔

(۱۶) عدالتی کارروائیوں سے واقف ہونے اور عدالتوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے سلاطین عدالتوں سے باخبر رہتے تھے۔ زمانہ حال کی مملکتوں میں بھی صدر مملکت اس بارے میں اپنے پاس رپورٹیں منگوا سکتے ہیں اور کبھی کبھی لغزش پر باز پرس کر سکتے ہیں۔ اس سے عدلیہ کی کارکردگی میں اضافہ کی توقع ہو سکتی ہے۔

(۱۷) رعایا کی انفرادی آزادی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

(۱۸) غیر مسلموں کے دیوانی مقدمات ان کے ہم مذہب اشخاص کے ذریعہ فیصل کرائے جاتے۔ اگر زمانہ حال کی کسی اسلامی مملکت میں دیوانی قضاء قسم کی عدالت پھر سے قایم کی جائے۔ اور قانون ملک میں اسلامی انداز نمایاں کیا جائے تو پھر غیر مسلموں کے دیوانی معاملات میں مذکورہ طریقہ کو نافذ کرنا پڑے گا۔

(۱۹) قانون سازی اور سزاؤں کے سلسلے میں سابقہ ادوار کے تجربوں سے آئندہ کے لئے مفید رہنمائی مل سکتی ہے۔ ان دونوں عنوانات پر ذیل میں کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

Marfat.com

قانون اور اجتہاد

اسلامی قانون کی اولین بنیاد کتاب اللہ ہے۔ رسول اکرمؐ فیصلہ کرتے وقت کتاب اللہ اور وحی الٰہی کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ جن معاملات میں کوئی حکم نہ ملتا، آپؐ خود اجتہاد کرتے اور بعض اوقات صحابہؓ سے بھی مشورہ فرماتے تھے۔ آپؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کے افعال اور اقوال کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ آپؐ نے اجتہاد کی طرف بھی دعوت دی۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن اور سنت میں کوئی حکم نہ ملے تو اپنی رائے اور عقل سے کام لیا جائے۔ یعنی اجتہاد کرنا ایک صالح عمل ہے۔ جب کبھی سرکار دو عالمؐ احکام بھیجتے تھے۔ ان کے ساتھ عام طور پر ان کے مصالح اور علل بھی ارشاد فرماتے تھے۔ ان سے احکام کی غرض و غایت ظاہر ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر آپؐ نے فرمایا کہ بلی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہوتا کیوں کہ یہ ان جانوروں میں ہے جو گھریلو بن چکے ہیں۔ اس طرح حکم کی علت غائی بھی معلوم ہو گئی۔ یہ انداز اجتہاد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے صحابہؓ کو اجتہاد کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مجتہد نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے اور غلطی کی تو ایک اجر ملے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہر صورت میں اجتہاد قابل تحسین ہے۔

بعض صورتوں میں جو چیز شروع میں منع تھی، وہ بعد میں جائز کر دی گئی۔ کیوں کہ حالات بدل گئے تھے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہیں زیارت قبور کی ممانعت کی تھی۔ لیکن اب تم زیارت قبور کر سکتے ہو"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرع کی غرض مصلحتِ وقت پر مبنی ہے۔ حالات کے مطابق شرعی احکام خدا کی طرف سے نازل ہوئے۔ اسی طرح جب کوئی ایسا مسئلہ پیش نظر ہو جس کے بارے میں قرآن و سنت سے مدد نہ مل سکے تو حالات اور مصالح کے لحاظ سے اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔

رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد عام نظم و نسق یا عدلیہ کے لئے جو قانون موجود تھا، وہ قرآن اور حدیث کا مجموعہ تھا۔ ساتھ ہی اجتہاد کے راستے بھی کھول دیئے گئے تھے کہ حالات اور مصالح کے لحاظ سے کس طرح رائے سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خلفائے راشدین نے اجتہاد رائے سے کام لیا۔ سب سے پہلے وہ نصِ قرآنی سے تلاش کرتے تھے، پھر اقوال و سنتِ رسولؐ دیکھتے تھے۔ کتاب و سنت میں کوئی حکم نہ ملتا تو اجتہاد رائے سے کام لیتے تھے۔

خلیفہ اوّل | خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو سب سے پہلے کتاب اللہ پر نظر دوڑاتے۔ جب کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملتا تو سنت نبوی سے یا اپنی معلومات سے فیصلہ فرماتے تھے۔ جب کبھی ان کے علم میں کوئی بات نہ ہوتی تو مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت کرتے

تھے کہ رسول اللہ صلعم کا فیصلہ مسئلۂ تصفیہ طلب کے بارے میں کسی کو معلوم ہو تو بتا دیں۔ اس تمام کوشش کے بعد کوئی پکی بات معلوم نہ ہوتی تو اہل الرائے کو جمع کر کے استفسار کرتے اور اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ کبھی اجتہاد رائے سے بھی کام لیتے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرتے وقت یہی کیا۔

خلیفہ دوم | حضرت عمرؓ بھی اپنے دوران خلافت میں اسی طریقے پر عمل پیرا رہے۔ کسی امر کا فیصلہ کرتے وقت کتاب و سنت سے واضح حکم نہ ملتا تو وہ خلیفہ اوّل کے فیصلوں کو مشعل راہ بناتے۔ جب اس سے بھی مطلب حل نہ ہوتا تو اہل الرائے کو جمع کر کے ان کی رائے پر عمل کرتے۔ اجتہاد رائے سے بھی کام لیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کیا جائے۔ نیز تین طلاقوں کو کلمہ واحد کے ساتھ واقع قرار دیا۔ حالانکہ "الطلاق مرتان" کا قرآنی حکم موجود تھا اور رسول اکرمؐ اور خلیفہ اوّلؓ کے زمانے میں اور خود عہد فاروقی کے ابتدائی دور میں وقت واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تسلیم کیا جاتا رہا۔ لیکن لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ اس لئے مصلحت وقت کے مدنظر حضرت عمرؓ اس اجتہاد پر مجبور ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مجلس شوریٰ کی تنظیم، نظم و نسق کی اصلاحات، قید خانوں کا قیام، خراج کا عاید کرنا وغیرہ سب اجتہاد ہی کے نتائج تھے۔

خلیفہ سوم | حضرت عثمانؓ نے بھی اجتہاد سے کام لیا تھا۔ نماز جمعہ کے لئے اذان ثانی کا اضافہ کیا گیا اور اس میں مصلحت وقت پیش نظر تھی۔ اسلامی سلطنت میں بڑی سرعت سے توسیع ہو رہی تھی حافظ قرآن مختلف شہروں میں پھیل رہے تھے اور حروف متعددہ کی قرأت سے اختلاف کا فتنہ پیدا ہو رہا تھا۔ آپ نے اپنے اجتہاد سے لوگوں کو صرف واحد کی قرأت پر مجبور کر دیا۔

خلیفہ چہارم | حضرت علیؓ نے بھی کئی اجتہاد فرمائے۔ قانون شہادت کے سلسلے میں ایک نئی اصلاح کی۔ جھوٹے گواہوں کا اظہار لیتے وقت دوسرے گواہوں کو عدالت سے ہٹا دیتے تھے۔ قانون وراثت میں حضرت علیؓ اصول عول اور رد کے بانی ہیں۔

حالات اور مصلحت | اسی طرح احکام حدود کے اجرا اور نفاذ میں مصلحت اور لوگوں کے حالات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قحط کے موقع پر چوری کی سزا میں قطع ید معطل کر دی گئی۔ اسی طرح جب اسلام خوب پھیل گیا تو مؤلفۃ القلوب کا جو حصہ مال غنیمت میں ہوتا تھا، اس کو حضرت عمرؓ نے بند کر دیا۔

Marfat.com

اموی اور عباسی دور خلافت راشدہ کی طرح اموی دور میں بھی قاضی اجتہاد سے کام لیتے تھے اور کسی مخصوص شخص کی پیروی یا تقلید نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں قاضیوں کو مکمل آزادی تھی کہ اپنی سمجھ کے مطابق جو فیصلہ چاہیں کریں۔ مثال کے طور پر توبہ بن نمر حضرمی جو ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں مصر کے قاضی تھے، اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان لوگوں کی جائداد کو جو بے دردی سے اپنا مال ضائع اور فضول خرچی کے ذریعہ تباہ کرتے تھے، سرکاری نگرانی میں محفوظ کر دیں۔

عباسی دور میں تہذیب و تمدن کے دائرے میں بڑی وسعت ہوئی۔ اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر دور دراز ممالک تک پھیل گیا اور علوم شریعت کے ماہر بھی مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ نیز مفتوحہ علاقوں میں کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس طرح نئے مسائل سے سابقہ پڑنے لگا۔ علم کو روز افزوں ترقی ہوئی۔ ایرانی، رومی، مصری بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے اور فارسی و یونانی زبانوں کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اس طرح دارالسلطنت بغداد میں دیگر اقوام کے علوم بھی راہ پانے لگے۔ احکام شریعت کو باقاعدہ کتابوں کی شکل میں مدون کیا جانے لگا۔ شریعت کے قوانین اور اصول کی بنیاد پر ایسے قوانین مرتب کئے گئے جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کر سکیں۔ حضرت مالک بن انس رح نے مؤطا لکھی۔ فقہا یعنی واضعین قوانین کا طبقہ وجود میں آیا۔ ان میں سے بعض فقہاء مخصوص مکاتب فکر کے بانی ہوئے۔ ان تمام فقہا نے پوری طرح اجتہاد سے کام لیا۔

لیکن اس دور ترقی کے بعد مسلمانوں میں عام جمود پیدا ہو گیا۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح:۔

"چوتھی صدی ہجری سے قبل عام مسلمان کسی خاص فقہی مذہب کے پیرو نہ تھے۔ پہلی دو صدیوں میں تو تقلید کا وجود ہی نہ تھا اور نہ کسی خاص مذہب کے اصول پر فتوی دینے کا دستور تھا۔ البتہ بعد کی دو صدیوں میں تخریج کا سلسلہ کسی حد تک شروع ہو گیا۔ لوگ فقہاء اور مجتہدین کے اصول اور فتاوی کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کرنے لگے۔ تاہم تقلید محض ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں قضاء اور افتاء کی مسند پر صرف وہی شخص متمکن ہو سکتا تھا، جو مجتہد ہوتا تھا۔ اور فقیہ بھی اسی کو کہا جاتا تھا۔ جو اپنے اندر اجتہاد کی قابلیت رکھتا تھا۔ لیکن چار صدیوں کے بعد مسلمانوں میں غیر شعوری طور پر تقلید داخل ہو گئی۔ اس کے سبب ذیل وجوہ تھے۔

Marfat.com

۱- فقہاء کی کثرت اور اختلافات- اعتراض سے بچنے کے لئے فقیہہ متقدمین کا حوالہ دینے لگے-

۲- عدم نگرانی کی وجہ سے اکثر قاضی حق و انصاف سے ہٹ رہے تھے- حکام نے ہدایت کی کہ وہ صرف ایک مذہب کی فقہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں-

۳- علم و فن زوال پذیر تھے- جو علما کہلاتے تھے- ان کے قلوب علم و عرفان سے خالی تھے- اور اجتہاد اور تخریج کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں- غیر مجتہد فقیہہ کہلانے لگے تھے- جہالت توہمات اور شکوک و شبہات کی گرم بازاری تھی- دینی مسائل میں اختلافات مناقشات اور مناظرات کے باعث ایک بڑا فتنہ پیدا ہو چکا تھا- ان واقعات اور حالات نے اندھی تقلید کے لئے راہ فراہم کر دی- فقہا تو بہت تھے- لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ متقدمین کے اقوال رٹ لیتے تھے- خود ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ ان اقوال پر غور کرتے اور یہ دیکھتے کہ کون سا قول کتاب و سنت کے مطابق ہے اور کون سا قول ایسا ہے جو نہ صرف کتاب و سنت بلکہ عقل سلیم کے منافی ہے- یہی حال علم حدیث کا تھا- محدث وہ تھے جن کو ہر قسم کی احادیث ازبر ہوتی تھیں- لیکن ان میں اتنا ملکہ نہ ہوتا کہ وہ صحیح اور ضعیف حدیث میں تمیز کر سکتے... اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی- زمانہ گزرتا گیا تو تقلید کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا"

بہرحال اس دور انحطاط میں اجتہاد کے راستے مسدود ہو گئے- نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی اور مصالح عوام میں کوئی ربط نہیں رہا اور اجتہاد کا دروازہ ہی بند سمجھا جانے لگا- فقہ اور مصالح عوام میں بعد المشرقین پیدا ہو گیا-

اس کے بعد جو ترک اور افغان ہندوستان آئے وہ بھی اسی تقلید اور جمود کا شکار رہے- صرف اتنا فرق تھا کہ نظم و نسق کے شعبے میں انہوں نے جدید قوانین وضع کئے تھے ______

______ اور دراصل یہ شرعی قوانین کے بعض اجزا میں رد و بدل تھا- اسلام کا قانون تعزیرات تو بہت متاثر ہوا اور اس زمانے سے جبکہ چار فقہی مذاہب پیدا ہوئے تھے مغلوں کے خاتمے تک قانون تعزیرات اور سزاؤں کے طریقے برابر بدلتے گئے- فرامین کی بدولت ایک قانون شاہی ترقی پا گیا- اس کے علاوہ ذمیوں سے متعلق نئے اصول اور قوانین وضع ہوتے رہے- یہاں تک کہ مغل شہنشاہیت اور بہمنی سلطنت کے دور میں ہندوؤں سے جزیہ نہیں لیا گیا-

دور جدید کی اکثر اسلامی مملکتیں اسلامی قانون کی بجائے دوسرے قوانین اختیار کرنے پر مجبور ہوئی ہیں- اس کی ایک وجہ تو مغربی ممالک کی سیادت تھی جو اس دور انحطاط میں اسلامی

Marfat.com

علاقوں پر مسلط تھے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں خود مسلمانوں کی کوتاہی معلوم ہوتی ہے۔ اسلام نے تو اپنے احکام کے منصوبہ میں استنباط کے جامع اصول وضع کر دیئے تھے، جو مصالح انسانی کے لحاظ سے مکمل ہیں اور ان اصولوں پر عمل کیا جاتا تو دوسرے عصری قوانین کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ مگر اہل علم اس طرف سے غافل ہو گئے۔ لوگ اپنی ذہانت اور قابلیت سابق ائمہ مجتہدین کے متضاد اقوال میں تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں صرف کرنے لگے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات، انسانی ضروریات اور مصلحت وقت کا انہوں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اسلامی مملکتیں اسلامی قانون کی بجائے غیر مسلم اقوام کے قوانین پر عمل کرنے لگیں۔

زمانہ حال کی بعض اسلامی مملکتوں نے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ فقر اور مصالح عوام میں جو بُعد المشرقین پیدا ہو گیا ہے، اس کو رفع کرنے کی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ مصر کی وزارت قانون نے احوال شخصیہ سے متعلق بعض احکام کو از سر نو ترتیب دیا۔ مثلاً طلاق، دعوائے نسب، نفقہ معتدہ، سن الحضانۃ، موت مفقود الخبر سے متعلق نئے احکام وضع ہوئے ہیں۔ نیز سوڈان، لبنان، شام، اردن اور عراق میں اسی قسم کی کوششیں ہوئی ہیں۔ خود پاکستان میں عائلی قوانین کا نفاذ جدید اصلاحی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ چونکہ یہ سارے مسائل اسلامی مملکتوں کے لئے یکساں ہیں، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ سب مل کر اشتراک عمل سے اس جانب اقدام کریں۔ یہ بات اگر فوری طور پر ممکن نہ ہو تو کم از کم چند مملکتیں ہی باہم اشتراک کریں۔

امام قرافی اور علامہ ابن قیم کے حسب ذیل ارشادات سے اس مبحث پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔

انشاد علاؤ الدین نے "معین الحکام" میں امام قرافی کا یہ قول بیان کیا ہے: "احکام سیاسی میں حکام کے اختیارات کی وسعت شرع کے منافی نہیں بلکہ قواعد کے لحاظ سے حسب ذیل وجوہ پر اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ اب فساد بڑھ گیا ہے اور عصر اول کے مقابلہ میں اس میں زیادتی ہو گئی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اختلاف حالات کے مطابق جن احکام کی تشریح کی جائے، وہ شرع کے قوانین کلیہ سے ہم آہنگ ہونے چاہئیں

۲۔ مصلحت مرسلہ سے مراد وہ مصلحت ہے، جو شارع علیہ السلام کے زمانے میں پیش نہ آئی ہو۔ اور جس کے منفی یا مثبت پہلو سے مطلق کوئی واضح حکم پہلے سے موجود نہ ہو۔

ایسے موقعوں پر خود صحابہ کرام نے بھی حالات کے لحاظ سے نئے احکام وضع کئے تھے۔ مثال کے طور پر قرآن شریف مرتب ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لئے نامزد کیا۔ دفاتر قایم ہوئے۔ سکہ ڈھالا گیا۔ جیل خانے تعمیر ہوئے وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مصلحت مطلقہ کے تحت وجود میں آئیں۔

غرض معاملات شرع میں ایسے اختلافات کثرت سے ملیں گے جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ رونما ہوئے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ کسی زمانے میں بھی حالات کو نظر انداز کیا جائے"

علامہ ابن قیم نے "الطرق الحکیمہ" میں ابن عقیل کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"سیاست وہ فعل ہے جس کے ذریعہ عوام اصلاح سے قریب تر ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور ہو جائیں۔ گو اس طریقہ عمل سے متعلق قرآن یا حدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سیاست وہی ہے، جس کی وضاحت شرع میں موجود ہے۔ خود صحابہ کرامؓ نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد رائے کا سلسلہ خلفاء راشدین کے عہد سے چلا آ رہا ہے۔ حضرت علیؓ کا زنادقہ کو جلانا، حضرت عثمانؓ کا غلط مصحفوں کو نذر آتش کرنا، حضرت عمرؓ کا نصر بن حجاج کو جلا وطن کرنا، یہ سب اجتہاد نہیں تو اور کیا ہے؟....

یہ ایک نازک مرحلہ ہے جہاں اقدام میں لغزش ہو سکتی ہے اور مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک جماعت تفریط سے کام لے سکتی ہے اور دوسری حدود سے تجاوز کر سکتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے حقوق پامال ہو جائیں اور اس طرز عمل سے یہ غلط نتیجہ ہو سکتا ہے کہ شریعت مصالح امت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ گویا اس طرح معرفت حق اور تنفیذ حدود کا جو صحیح ترین راستہ تھا وہ بند ہو جائے گا۔ اس بھنور سے لوگوں کا نکلنا ضروری ہے"

غرض جہاں قرآن اور سنت خاموش ہوں اور نئے حالات اور مصالح کے لئے واضح قانون نہ ملتا ہو تو وہاں اجتہاد ہی ایک آلہ کار ہے اور اسی واسطے سے قانون اسلام نے بسط و کشاد کی بڑی گنجائش رکھی ہے۔ اس موقع پر یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ جمود و تعطل کی اس بھنور سے نکلنے کے لئے انفرادی اجتہاد موجودہ حالات میں مفید نہ ہوگا۔ بلکہ اس سے شر کا دروازہ کھل جائے گا۔ اجتماعی طور پر اجتہاد کیا جائے تو یہی بہترین حل ہوگا۔ اگر مسلمان ہر زمانے میں ایسی تشریعی جماعت تشکیل دیتے جو اہل علم پر مشتمل ہوتی تو ہمیشہ ان کے لئے ضروریات زمانہ کی کفالت ہو جاتی۔ اندلس کی دولت امویہ کے دور میں قرطبہ میں ایک "مشورہ گھر" بنا تھا۔ جو بڑے بڑے علماء

Marfat.com

پر مشتمل تھا۔ اس مجلس شوریٰ نے امام مالک کے اخذ کردہ بیشتر مسائل سے اختلاف کیا۔ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں دولت عثمانیہ نے علماء اور فقہاء کی ایک جماعت قائم کی جس کا نام جمعیۃ المجلۃ تھا۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ میں جو سنہ ۱۲۹۳ھ میں ترکی حکومت کی طرف سے نافذ ہوا، اس جماعت نے امام ابوحنیفہ کی اکثر آراء سے اختلاف کیا۔ اس میں خرید و فروخت کے احکام ابن شبرمہ کے بیان کردہ مسائل کے مطابق ہیں۔

مختلف مذاہب فقہ کے ایسے اہل علم جو اصول قانون اور فقہ پر مہارت تام رکھتے ہوں، حالات حاضرہ اور لوگوں کی ضروریات سے واقف ہوں، مسائل اور بدلے ہوئے حالات سے آشنا ہوں، استنباط مسائل و احکام کے اہل ہوں، قوانین ملک اور عصری قانون سازی کے اصول اور تکنیک سے واقفیت رکھتے ہوں، ایک جماعت کی شکل میں یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔

سزائیں

اشاعت اسلام سے قبل عربوں میں حد کی سزاؤں کا رواج تھا۔ جب اسلام کا عمل دخل شروع ہوا تو سزا کے لئے برابر حد جاری کی جاتی تھی۔ شریعت نے بعض جرائم میں حد کو انتہائی سزا کے طور پر تسلیم کر لیا ہے مگر اس کے اجراء میں سخت شرائط عاید کر دیں۔ یہ احکام کافی سخت ہیں اور اس وجہ سے بہت کم صورتوں میں اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ صرف چند ہی مثالیں ایسی ہیں، جن میں احکام حد جاری کئے گئے۔

حد کی یہ شکلیں ہیں: موت بذریعہ رجم، قطع عضو یا اعضاء، سو یا اسی درے لگانا۔ شریعت میں حد کے علاوہ دوسری قسم کی سزا تعزیر ہے۔ وہ جرائم جو جان، جسم انسانی، جائداد، امن و امان، اخلاق، تہذیب، مذہب وغیرہ سے متعلق ہیں ان میں تعزیر کی سزا دی جاتی ہے۔ اور یہ حاکم وقت کی صواب دید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کے لئے تنبیہہ، جرمانہ، جسمانی سزا، قید اور جلا وطنی کی سزائیں دی جاتی ہیں۔

حدود کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو حقوق اللہ کی خلاف ورزی سے اور دوسری وہ جو حقوق انسانی کی خلاف ورزی سے عمل میں آئیں۔ حقوق اللہ سے متعلق جو حدود ہیں، ان کی ایک قسم یہ ہے کہ ترک فرائض کیا جائے۔ مثلاً فرض نماز کو کوئی شخص منکر وجوب ہو کر ترک کرے۔ تارک نماز کے بارے میں علماء کہتے ہیں کہ زدوکوب کیا جائے اور زندان میں رکھا جائے۔ اکثریت کا خیال یہ ہے کہ ترک نماز سے وہ کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ اگر تائب نہ ہو تو ارتداد کے جرم

Marfat.com

میں قتل کیا جائے۔ اعتراف وجوب کے ساتھ صرف کاہلی سے نماز ترک کر دے تو اس کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا خیال یہ ہے کہ تارک نماز ہر نماز کے وقت پیٹا جائے۔ قتل نہ کیا جائے۔ امام احمدؒ اور محدثین کی ایک جماعت اس خیال کی حامی ہے کہ قتل کیا جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ترک نماز سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا اور مرتد بھی نہیں ہوتا اس لئے حد کی سزا میں قتل نہ کیا جائے۔

امتناع ممنوعات سے جو امور واجب ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقوق اللہ سے متعلق ہے اور دوسری حقوق العباد سے۔ اول الذکر کی مثال میں حد زنا، حد خمر، حد سرقہ، حد محاربہ ہیں اور دوسری قبیل میں حد قذف بالزنا اور قذف فی الجنایات ہیں۔ ان میں سے کسی ایک مثلاً سرقہ کی سزاؤں کو دیکھا جائے تو مختلف آراء نظر آتے ہیں۔

کسی محفوظ مال کو جس کی قیمت نصاب سے کم نہ ہو کوئی عاقل بالغ چرا لے بشرطیکہ اس کو مال میں اور اس کی حفاظت میں شبہ نہ ہو تو یہ سرقہ ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ پہنچے پر سے قطع کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد پھر چوری کرے تو بایاں پیر ٹخنے پر سے قطع کیا جائے۔ تیسری مرتبہ چوری پر اختلاف رائے ہے۔ حضرت علیؓ، امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ عضو قطع نہ کیا جائے۔ بلکہ قید میں رکھا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور امام شافعی کے خیال میں تیسری بار بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ دایاں پیر قطع کیا جائے۔ پانچویں مرتبہ چوری کرے تو تعزیر کیا جائے، قتل نہ کیا جائے۔

مقدار نصاب سے متعلق بھی اختلاف ہے۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ کی رائے میں ربع دینار یا اس سے زیادہ کی مالیت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ایک دینار یا دس درہم کو نصاب قرار دیتے ہیں۔ ابراہیم نخعی چالیس درہم یا چار دینار کو اور ابن ابی لیلیٰ پانچ درہم کو نصاب قرار دیتے ہیں۔ امام داؤد کے خیال میں نصاب کا تعین ہی نہیں ہے۔ قلیل ہو کہ کثیر جو بھی سرقہ کی تعریف میں آجائے قطع حد کی حد جاری ہونی چاہیئے۔

مال کی نوعیت کے متعلق بھی یہی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس مال کی چوری پر مستوجب قطع ہے، جو چور پر حرام ہو۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جس مال کی اصل مباح ہو اس میں قطع جائز نہیں مثلاً شکار، لکڑی، گھاس۔ لیکن امام شافعی کے خیال میں جب ان کا کوئی مالک ہو جائے تو قطع واجب ہے۔ اسی طرح تر طعام میں امام ابوحنیفہ قطع

Marfat.com

کو درست نہیں کہتے اور امام شافعی درست بتاتے ہیں۔ سارق مصحف یا قندیل مسجد کے چرانے پر امام ابو حنیفہ قطع کو جائز نہیں سمجھتے اور امام شافعی جائز سمجھتے ہیں۔

یہی حال حفاظت کے مسئلہ کا ہے۔ مال کا محفوظ جگہ سے چرانا ضروری ہے۔ وہ مال جو مالک کہیں گم کر دے اور وہ پھل جو کسی صحرائی درخت پر غیر محفوظ حالت میں دستیاب ہو، اس کی چوری پر قطع ید نہیں صرف تعزیر کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس مسئلہ میں کہ جس شخص کا مال چوری ہو جائے، اس کا مطالبہ قطع کے لئے لازمی ہے یا نہیں فقہا مختلف الرائے ہیں۔

اس اختلاف رائے سے قطع نظر یہ اصول بھی مسلمہ ہے کہ شک اور شبہ کی حالت میں حد ساقط ہو جاتی ہے۔ شبہتہ المحل اور شبہتہ الفعل کے مسائل میں فقہاء کرام کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجوہ ہیں کہ اسلامی مملکتوں میں مرور زمانہ کے ساتھ قانون اور طریقہ تعزیر میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں اجرائے حد کے شرعی احکام ایک دلچسپ داستان پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال ان احکام سے یہ اصول واضح طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ قوم کے رسم و رواج اور اعمال میں اسی حد تک دست اندازی ہونی چاہیئے جو ان کے بیجا استعمال اور دست درازیوں کے سدباب کے لئے ضروری ہو۔ جدید اصول تعزیر تدریج اور رائے عامہ کے ساتھ اختیار کرنا چاہیئے۔

جہاں تک ان احکام کے نفاذ کا تعلق ہے، یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ خلفاء راشدین کے عہد میں قصاص اور حدود کے اجرا کے احکام خود خلفا اور علاقائی حکام دیتے تھے۔ قاضیوں کے سامنے اس قسم کے مقدمات پیش نہیں ہوئے تھے۔ نیز قید یا جرمانہ جیسی تمام تادیبی سزائیں بھی خلیفہ جاری کرتے یا ان کے عامل۔ قاضی صرف دیوانی مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ بعض مرتبہ کسی قاضی کو بھی یہ کام تفویض کیا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قاضی ابوادریس خولانی کو مظالم کی روک تھام، مظلوموں کی دادرسی اور مجرموں کی سزا دہی کے لئے مقرر کیا تھا۔ مامون الرشید نے اپنے قاضی یحییٰ بن اکثم کو اور معتصم نے قاضی احمد بن ابو داؤد کو بھی یہ امور تفویض کئے تھے۔ امیر معاویہ نے قاضی مصر سلیم بن عتر کو فوجداری مقدمات کی بھی سماعت کا اختیار دیا تھا۔

مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ سزاؤں میں بھی تخفیف ہوتی رہی۔ مثال کے طور پر خلیفہ دوم رضؓ نے بار بار شراب پینے پر حد کی بجائے قید کی سزا دی تھی۔ صرف نقب زنی کی صورت میں جب کہ چوری کا ارتکاب نہیں ہوا تھا، حضرت علیؓ نے قطع ید کی سزا نہیں دی بلکہ چند کوڑے لگوا دیئے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں امیر معاویہ نے سزاؤں میں تخفیف کر دی یہ اس حق کا استعمال ہے جو مسلمان حکمرانوں

Marfat.com

کو حاصل ہے۔ اکثر حنفی علماء سزائے قید کو درست نہیں سمجھتے تھے چنانچہ مصر میں خلیفہ مہدی نے حنفی قاضیوں کو اسی بنا پر کہ سزائے قید نہیں دیتے تھے، خدمت سے الگ کر دیا۔ ہند و ستان میں سلاطین دہلی نے تقریباً ہر قسم کے مقدمہ میں یہ حق استعمال کیا تھا۔ چنانچہ سرقہ سے لے کر قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی سزاؤں میں بھی تخفیف کر دی۔ فیروز تغلق نے تو ایک نئے ضابطہ کی بنا ڈالی اور تعزیری سزاؤں میں جو حسب شرع مقرر تھیں، ترمیم کر دی۔ بہمنی سلاطین نے بے عزتی کے لیے موت کی بھی سزا دی۔ سب سے زیادہ سزائیں باغیوں کو دی گئیں۔ کبھی قتل کر دیا اور کبھی جلا وطن۔ لیکن اکثر صورتوں میں معافی دی گئی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کو قتل کیا گیا۔ سناروں کو جو سکہ کھرا دیتے تھے، موت کی سزا دی گئی۔ شراب خوری پر کوڑے لگوائے اور بدکار عورتوں کو شہر بدر کیا گیا۔ عادل شاہی سلاطین سیاسی ملزموں کو بھی معاف کر دیتے تھے۔ بغاوت سنگین جرم سمجھا جاتا تھا اور بعض کو موت کی سزا دی گئی۔ بعض امراء اور عہدہ داروں کو بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا گیا۔ جلا وطنی کی بھی سزا دی گئی۔ افراد مملکت کی بے عزتی کرنے پر عہدہ داروں کو معزول کیا گیا۔ قطب شاہی دور میں چوری اور قزاقی کی سخت سزا تھی۔ ابراہیم قطب شاہ نے چوروں اور ڈاکوؤں کے استیصال کے لئے یہ حکم دیا تھا کہ ان کو کوڑے مارے جائیں اور پیر کے ناخن جدا کئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلنگانہ جو سند و چوروں اور قزاقوں سے بھرا ہوا تھا، پُر امن ہو گیا۔ تاہم یہ اسلامی سزا نہ تھی بلکہ ایک نئی چیز تھی۔ اس طرح تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یا تو سزاؤں ہی تخفیف ہوتی گئی یا حالات اور ضروریات کے ساتھ ان میں تبدیلی ہو گئی

غرض حدود اور ان کے تعمیلی مسائل میں ائمہ مجتہدین مختلف الرائے ہیں۔ نیز حدود کے نفاذ کے لئے کڑی شرطیں عاید ہیں اور اس کے علاوہ مرور زمانہ کے ساتھ سزاؤں میں تبدیلی ہوتی رہی تو زمانہ حال میں جب کہ تعزیری قانون کے بارے میں اصلاحی نظریات اور متبدلہ رائیں زیر بحث آ رہی ہیں، تو علمائے عصر کے لئے غور و فکر کا یہ اچھا موضوع ہے۔ یہ سخت سزائیں، عرب کے ماحول کے لئے نافذ ہوئی تھیں۔ اب ان کا نفاذ عصر حاضر میں مشکل ہو گا۔ مثال کے طور پر تارک نماز کا قتل یا سارق کا قطع ید ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ علمائے عصر اس پر غور کریں اور اتفاق رائے سے ایسا لائحہ عمل تیار کریں جو عصر حاضر کی خصوصیات کا جواب دے۔

Marfat.com

Marfat.com

کتابیات

البلاذری	فتوح البلدان - اردو ترجمہ ابوالخیر مودودی - نفیس اکیڈمی - کراچی - ۱۹۶۲ء
البخاری - ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل	کتاب الجامع الصحیح - مرتبہ ایل - کریل - ۴ جلد - لیڈن - ۱۸۶۲ء - ۱۹۰۸ء - اردو ترجمہ شیخ غلام علی اینڈ سنز - علمی پرنٹنگ پریس لاہور - ۱۹۶۲ء -
ابن حجر عسقلانی - شہاب الدین بن علی -	تہذیب التہذیب - ۱۲ جلد - حیدرآباد ۱۳۲۶ھ [illegible] (الاصابہ [illegible]) مرتبہ [illegible] رضوان - قاہرہ ۱۹۵۲ء -
ابن حنبل - احمد -	المسند - مرتبہ احمد محمد شاکر - ۱۵ جلد قاہرہ - ۱۹۴۹ء
ابن حزم - ابو محمد علی	کتاب الاحکام فی اصول الاحکام - ۸ جلد - قاہرہ [illegible]
الخضری	محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ - ۲ جلد طبع چہارم مصر [illegible]
	الدولۃ العباسیہ - طبع چہارم مصر ۵۳ [illegible]
ابن خلدون - عبدالرحمن -	المقدمہ - مرتبہ کاترمیر - تین جلد - پیرس ۱۸۵۸ء وطبع بہبیۃ مصر - انگریزی ترجمہ روزنتال - لندن ۱۹۵۸ء -
ابن خلکان - ابوالعباس شمس الدین احمد -	وفیات الاعیان - مرتبہ عبدالحمید - ۶ جلد - قاہرہ ۱۹۴۸ء -
ابن سعد - محمد -	کتاب الطبقات الکبیر - مرتبہ یوجین متوخ و ایڈورڈ سخاؤ - ۹ جلد - لیڈن - ۱۹۰۵ء - ۱۹۴۰ء

Marfat.com

بشیر احمد۔ — ایڈمنسٹریشن آف جسٹس اِن میڈیویل انڈیا۔ (انگریزی) علی گڑھ ۱۹۴۱ء۔

برنی۔ ضیاء الدین۔ — تاریخ فیروز شاہی۔ کلکتہ ۱۸۶۲ء

علی بن عزیز اللہ طبا طبائی۔ برہان مآثر۔ — ۱۰۰۰ھ (مجلسِ مخطوطاتِ فارسیہ حیدرآباد ۱۹۳۶ء)۔

عبدالمجید صدیقی (پروفیسر) — تاریخ گولکنڈہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد ۱۹۳۹ء۔

تری پتی (ڈاکٹر آر۔ پی) — سم ایسپکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن (انگریزی) الہ آباد ۱۹۳۶ء

خافی (محمد ہاشم) — منتخب اللباب۔ جلد ۳۔ کلکتہ ۱۹۲۵ء

زبیری (مرزا ابراہیم) — بساطین السلاطین۔ مطبع سعیدی۔ حیدرآباد ۱۳۰۷ھ

شیرازی (رفیع الدین) — تذکرۃ الملوک۔ ۱۰۱۷ھ (مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ)

عصامی (مولانا) — فتوح السلاطین۔ ۷۵۱ھ۔ مرتبہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین آگرہ ۱۹۳۸ء۔

فرشتہ (ملا محمد قاسم) — گلشنِ ابراہیمی (بہمنی دور جلد ۱۔ بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ جلد ۲)۔ نولکشور کانپور۔ ۱۸۷۴ء۔

قریشی (ڈاکٹر اشتیاق حسین) — ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیت آف دہلی (انگریزی) لاہور۔ ۱۹۴۲ء۔

محمد اللہ — اے ڈسرٹیشن اون دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس آف مسلم لا (انگریزی) الہ آباد۔ ۱۹۲۶ء۔

ملکاپوری۔ عبدالجبار خان — محبوب التواریخ۔ حسن پریس۔ حیدرآباد دکن ۱۳۳۱ھ۔

منہاج۔ سراج — طبقات ناصری (فارسی)۔ کلکتہ ۱۸۶۴ء۔

واحد حسین۔ — ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ دی مسلم رُول اِن انڈیا (انگریزی)۔ کلکتہ ۱۹۳۴ء۔

بشیر الدین احمد۔ — واقعات مملکتِ بیجاپور۔ جلد ۱ و ۳۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۳۲ھ۔

حمید اللہ۔ ڈاکٹر۔ — دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور۔ حیدرآباد دکن۔

امام ابوحنیفہ کی تدوین فقہ اسلامی۔ حیدرآباد۔ ۱۹۴۲ء

Marfat.com

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں (مقالہ) مجلہ عثمانیہ حیدر آباد۔ جلد ۱۱ شمارہ ۱-۲-۱۳۴۸ فصلی۔

خواجہ منعم خان۔ سوانح دکن مخطوطہ۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد۔
تاریخ قطب شاہی مخطوطہ انڈیا آفس لندن۔

دو بنسوان روس۔ سر — تاریخ فخر الدین مبارک شاہ مرورودی۔ لندن ۱۹۲۷ء۔

زور۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔ — سلطان محمد قطب شاہ۔ حیدر آباد ۱۹۴۰ء

زین الدین معبری۔ — تحفۃ المجاہدین۔ مخطوطہ کتب خانہ قاضی عبد اللہ مرحوم مدراس۔

سرخسی (شمس الدین م ۴۹۵ھ) — المبسوط مصر ۱۳۲۴ھ ۳۰ جلد۔

سیوطی۔ امام جلال الدین۔ — تاریخ الخلفاء۔ اردو ترجمہ محمد خلیل الرحمان۔ لاہور۔

شاہ ولی اللہ۔ — حجۃ اللہ البالغہ ترجمہ اردو لاہور۔

صبحی محمصانی۔ ڈاکٹر۔ — فلسفۃ التشریع الاسلامی۔ بیروت ۱۹۴۶ء۔ اردو ترجمہ مجلس ترقی ادب۔ لاہور

عبد الحفیظ صدیقی۔ — اسلامی عدل گستری۔ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن۔

عبد السلام ندوی — القضاء فی الاسلام۔ المذکور تاریخ فقہ اسلامی ترجمہ
تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ الخضری۔

عتیق اللہ۔ ابو حفص محمد۔ — حسن المساعی الی نصح الرعیۃ والراعی (اردو)

غلام علی آزاد — سبحۃ المرجان۔ مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ۔ حیدر آباد دکن۔

غلام امان خان ترین — تاریخ رشید الدین خانی علی گڑھ ۱۲۰۰ھ

کرامت علی محمد دہلوی — سیرۃ محمدیہ (باب حجۃ الوداع) حیدر آباد دکن۔

نہاوندی۔ ملا عبد الباقی — مآثر رحیمی۔ کلکتہ ۱۹۱۰ء

نور اللہ — تاریخ علی عادل شاہ۔ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ

قلقشندی — صبح الاعشی۔ الجزء الثالث مطبع امیریہ قاہرہ ۱۹۱۸ء

ماوردی۔ امام ابو الحسن۔ — احکام السلطانیہ (ترجمہ اردو) جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔

مشرفۃ (عطیہ مصطفیٰ) — القضاء فی الاسلام۔ مصر ۱۹۳۹ء

Marfat.com

محمد بن عبداللہ جامی۔	حبل المتین فی احکام السلاطین (اردو) حیدرآباد۔
	النجم الثاقب فی اقضیۃ علی بن ابی طالب (اردو) حیدرآباد۔
محمد علی بن محمد صادق۔	مرآت الصفا۔ ۱۱۷۹ھ۔ کتب خانہ آصفیہ۔ حیدرآباد۔
محمد مرتضیٰ۔	عہد سلف۔ حیدرآباد ۱۳۴۸ھ
محمود بن محمد بن عرنوس۔	قاضی عدالت ہائے شرعیہ مصر۔ تاریخ القضاء فی الاسلام۔ اردو ترجمہ از شیخ محمد احمد پانی پتی۔ لاہور۔
میر عالم۔ ابوالقاسم۔	حدیقۃ العالم۔ حصہ اول۔ حیدرآباد۔

○

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (قرآن مجید-۴-۵۸)

برِصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظامِ عدل گستری

پروفیسر محمد عبدالحفیظ صدیقی

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی
اسلام آباد

Marfat.com